www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

الرسالہ

Al-Risala

March-April 2024 • Rs. 40

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Mar-Apr 2024 | Volume 49 | Issue 2

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: cs.alrisala@gmail.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹40 per copy
Subscription by Book Post	₹200 per year
Subscription by Regd. Post	₹400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Saniyasnain Khan
State Bank of India
A/c No: 30087163574
IFSC Code: SBIN0009109

UPI
UNIFIED PAYMENTS INTERFACE

To order books by
Maulana Wahiduddin Khan
please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

تحریر

مولانا وحید الدین خاں

فہرست

رمضان کا مہینہ	4
اللہ کی مدد	5
پیٹنٹ کا قانون	6
تواضع کی صفت	8
سوال کی کثرت	9
مقدمہ	11
مطالعۂ حدیث	13
سی پی ایس کا مشن	25
خواتین میں دعوت	27
جنت ماں کے قدموں کے نیچے	29
کامیابی کا پہلا قانون	31
ڈائری 1986	33
عیب خوانی، قصیدہ خوانی	50

हौसलामन्दी	1
रिवाजी ज़ेहन	2
अजीब करिश्मा	3
सबसे बड़ी ख़बर	5
अंधविश्वास	6
इन्सान किधर	7
जंग नहीं	8
एक और आवाज़	9
ज़माने के ख़िलाफ़	10
प्राकृतिक तक़ाज़ा	12
एक नसीहत	13
इस्लाम की तस्दीक़	14
दृष्टिहीन, दृष्टिवान	16

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd. A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

رمضان کا مہینہ

آج (20 مئی 1986 کو) دسواں روزہ ہے۔ اس سال رمضان کا مہینہ عین مئی جون میں پڑا ہے۔ مہینہ شروع ہونے سے پہلے مجھے سخت تردد تھا کہ شدید گرمیوں کے موسم میں اس سال کا روزہ کیسے گزرے گا۔ مگر دس روزے اس طرح ختم ہو گئے کہ یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ زندگی میں کوئی بہت غیر معمولی بات پیش آئی ہے۔

عام دنوں میں اگر صبح سے شام تک بھوکا رہنا ہو تو وہ بہت ہی سخت معلوم ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ مگر یہی فاقہ کے دن روزے کے مہینے میں اس طرح گزر جاتے ہیں کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ روزے کا مہینہ کب آیا اور کب چلا گیا۔

روزہ کے بہت سے دینی اور روحانی فائدے ہیں۔ ان میں سے غالباً ایک فائدہ یہ ہے کہ روزہ دینی حوصلہ بڑھانے کا ایک سبق ہے۔ روزہ کے ذریعہ ہر سال آدمی کو یہ تجربہ کرایا جاتا ہے کہ خدا کے راستے کی مشکلوں کو مشکلیں نہ سمجھو۔ خدا کے راستے کا کوئی کام بظاہر کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو، اگر تم خدا کے بھروسے پر اس کام کو شروع کر دو تو خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہو جائے گی۔ اور وہ کام اس طرح پورا ہو جائے گا کہ آخر کار تمہیں یہ محسوس بھی نہ ہوگا کہ یہ کوئی مشکل یا دشوار گزار کام تھا۔

میری زندگی بے حد سادہ ہے۔ کھانے پینے کے معاملے میں میرا کوئی شوق نہیں۔ معمولی سے معمولی چیز کو بھی میں اس طرح کھاتا ہوں جیسے کہ وہ اللہ کی کوئی بہت بڑی نعمت ہو۔ مگر اپنی جسمانی کمزوری کی وجہ سے میرا یہ حال ہے کہ بھوک پیاس مجھے برداشت نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہر سال روزہ سے پہلے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اس سال کا روزہ کیسے گزرے گا۔ مگر جب روزہ کا مہینہ آتا ہے تو وہ کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے جیسے کہ پہلی تاریخ کے بعد ہی اس کی تیس تاریخ آ گئی ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات خالص خدا کی مدد سے ہوتی ہے۔ روزہ کے ذریعہ روزہ دار کو یہ نمونہ دکھایا جاتا ہے کہ خدا کی مدد ہر مشکل کام کو آسان کر دیتی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی وش فل تھنکنگ (wishful thinking) کے بجائے ممکن اسباب استعمال کر کے اللہ کے بھروسے پر اپنے کام کا آغاز کرے۔ (ڈائری، 20 مئی 1986)

اللہ کی مدد

قرآن میں ایک حقیقت کو دو مقام پر بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک آیت یہ ہے: وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (22:40)۔ یعنی اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے۔ بیشک اللہ زبردست ہے، زور والا ہے۔ دوسرے مقام پر یہ الفاظ ہیں: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ (47:7)۔ یعنی اے ایمان والو، اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا۔

اس آیت کا مطلب عام طور پر یہ لیا گیا ہے کہ باطل کے خلاف جن لوگوں نے پیغمبر کا ساتھ دیا، صرف ان کے بارے میں یہ آیتیں ہیں۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ کے بارے میں اللہ کا منصوبہ کیا ہے، اس کو جانو، اور اس میں اہل حق کا ساتھ دو۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں آیتیں کسی مخصوص دور کے بارے میں نہیں ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا یہ منصوبہ پوری تاریخ کے بارے میں ہے، اور اہل حق سے کہا گیا ہے کہ وہ تاریخ کے خدائی منصوبے کو جانے اور ان لوگوں کا ساتھ دے، جو اس معاملے میں اللہ کے منصوبے کی تکمیل کے لیے کام کر رہے ہیں۔

مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ میرے لیے ساری زمین مسجد بنا دی گئی (صحیح مسلم، حدیث نمبر 522)۔ اس حدیث میں ایک عالمی مسئلے کا ذکر ہے۔ یعنی اللہ کا منصوبہ یہ تھا کہ قرآن کی دعوت عالمی سطح پر پھیلے۔ یہ منصوبہ مکمل طور پر پیس فل منصوبہ تھا۔ مگر مسلمانوں نے اس منصوبے کو سمجھا نہیں، اور جنگی کارروائی میں مشغول ہو گئے۔ ان آیات یا حدیثِ رسول سے مراد مکمل طور پر پرامن دعوتی منصوبہ ہے۔ اس کا کوئی تعلق جنگ یا قتال سے نہیں ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ساری زمین اہلِ اسلام کے لیے ورک پلیس ہے۔ ساری زمین ان کے لیے میدانِ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ مکمل معنوں میں پرامن رہیں، اور اس خدائی منصوبہ میں اپنے آپ کو لگا دیں۔

پیٹنٹ کا قانون

دور جدید میں ایک نیا ظاہرہ وجود میں آیا ہے۔ وہ ہے ایک موجد کو اس کی ایجاد پر محدود وقت کے لیے استعمال کی اجارہ داری دینا۔ اس کو قانون کی زبان میں پیٹنٹ (patent) کہا جاتا ہے۔ یہ انٹلیکچول پراپرٹی (intellectual property) کی ایک قسم ہے جو اس کے مالک کو قانونی حق دیتا ہے کہ وہ اپنی ایجاد کردہ چیز کو دوسروں کو محدود مدت کے لیے اس کی اجازت کے بغیر استعمال کرنے یا فروخت کرنے سے روک دے یا اس پر کچھ رائلٹی حاصل کرے۔ یعنی پیٹنٹ کا قانون ایک مقررہ مدت کے لیے صاحبِ ایجاد کو اس کے عمل کے اوپر خصوصی حقوق فراہم کرتا ہے۔

> A patent is a temporary Government grant of a monopoly to the inventor in return for complete disclosure about the invention to the Government.

یہ ایک عارضی گرانٹ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کوئی ایجاد بھی ایک انسان کی تنہا کوششوں کا نتیجہ نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس میں پچاس فیصد سے زیادہ براہ راست یا بالواسطہ تعاون فطری وسائل اور دوسرے انسانوں کا ہوتا ہے۔ اس کی رعایت کرتے ہوئے انسان کو اس کی ایجاد کے لیے محدود وقت کا پیٹنٹ حق دیا جاتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق، پہلا ریکارڈ شدہ پیٹنٹ 1421ء میں اٹلی کے معمار اور انجینئر فلیپو برونیلیچی (Filippo Brunelleschi, 1377-1446) کو دیا گیا تھا۔

پیٹنٹ کا قانون کائنات کی ایک فطری حقیقت کی یاد دہانی کراتا ہے۔ وہ ہے مخلوق کے اوپر اس کے خالق کی اجارہ داری کو قبول کرنا۔ انسان کی ایجاد کے برعکس، خالق کی ایجاد میں کسی کی کوئی شرکت نہیں ہوتی ہے، یعنی خالق نے کسی شریک کی مدد کے بغیر تنہا اپنی مخلوق کو ایجاد (پیدا) کیا ہے، اور ہر لمحہ وہ اس کی نشو ونما کے اسباب فراہم کر رہا ہے۔ اس لیے خالق کی ایجاد پر خالق کی اجارہ داری محدود مدت کے لیے نہیں ہوسکتی ہے، بلکہ مخلوق کے اوپر خالق کی اجارہ داری ابدی ہے۔

خالق نے اپنے تخلیق کا ثبوت انسان کے سامنے واضح طور پر رکھ دیا ہے۔ یہ ثبوت قرآن کے اندر بیان کیے گئے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انسان کھلے ذہن کے ساتھ اس کتاب کا

مطالعہ کرے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔ اس سے یہ حقیقت انسان کے سامنے کھل جائے گی کہ اس کا خالق اس سے کیا چاہتا ہے۔ اور ایسا کرنے کی صورت میں انسان کو کیا فائدہ حاصل ہوگا۔

جس طرح دنیوی رواج کے مطابق، ایک انسان اپنی ایجاد پر رائلٹی (royalty) کا حقدار ہوتا ہے، اسی طرح اللہ رب العالمین بھی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی خلق اور ایجاد پر اس کو رائلٹی ادا کی جائے۔ ہر عورت اور مرد اپنی ذات، اور دنیا میں موجود جن چیزوں سے بھی وہ فائدہ اٹھاتا ہے، اس کی رائلٹی وہ خالق کو ادا کرے۔

> A royalty is a legally binding payment made to an individual or company for the ongoing use of their assets, including copyrighted works, franchises, and natural resources.

وہ رائلٹی ہے، اللہ کی عبادت اور اس کے لیے سبمیشن۔ یہ ایک انسان کے لیے فطری بائنڈنگ ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، تاکہ تم دوزخ سے بچ جاؤ۔ وہ ذات جس نے زمین کو تمہارے لیے بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت بنایا، اور اتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کیے پھل تمہاری غذا کے لیے۔ پس تم کسی کو اللہ کے برابر نہ ٹھہراؤ، حالاں کہ تم جانتے ہو (2:21-22)۔

اگر کائنات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے سوا تمام مخلوقات خالق کے آگے جبلت (instinct) کے تحت اپنے آپ کو سرینڈر کیے ہوئے ہیں۔ صرف انسان ایسی مخلوق ہے جس میں سے کچھ لوگ خالق کے آگے مکمل طور پر سرینڈر کیے ہوئے ہیں، اور کچھ لوگ سرینڈر نہیں کیے ہوئے ہیں (الحج، 22:18)۔ ایسا اس لیے ہے کہ منصوبہ تخلیق کے تحت رب العالمین نے انسان کو اپنے آگے جھکنے کے معاملے میں آزادی دے رکھی ہے، اور اس کی یہ مرضی ہے کہ انسان اپنے آزادانہ ارادے کے تحت اپنے خالق یعنی رب العالمین کے آگے جھک جائے، اور وہ اپنے شعوری ارادے کے تحت اس کو اپنا رب تسلیم کرلے، اور بطور ٹوکن خالق کو اپنی طرف سے کچھ رائلٹی ادا کرے۔ جو لوگ ایسا کریں گے، ان کے لیے خدا نے اپنی رحمت سے ایک ابدی انعام تیار کر رکھا ہے، یعنی ابدی جنت میں سچائی کی سیٹ کا پروانہ عطا کرنا۔ (ڈاکٹر فریدہ خانم)

تواضع کی صفت

تواضع ایک اہم ایمانی صفت ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی خود پسندی نہ کرے۔ کیوں کہ خود پسندی خدا کے بجائے اپنے آپ کو بڑائی کا مقام دینا ہے۔ اس کے بجائے وہ خدا پرستی، تواضع، وغیرہ کو اپنا شیوہ بنائے۔ ایسا کرنا ثابت کرتا ہے کہ آدمی اپنے ایمان میں سنجیدہ ہے، اور ایسا نہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے ایمان میں سنجیدہ نہیں۔

عملی طور پر بھی اسلام تواضع کی تعلیم دیتا ہے۔ مثلاً نماز اسلام کا ایک رکن ہے۔ نماز میں جو کلمہ سب سے زیادہ دہرایا جاتا ہے، وہ ہے اللہ اکبر۔ اذان اور نماز دونوں کو ملا کر روزانہ تقریباً تین سو بار یہ کلمہ دہرایا جاتا ہے۔ اللہ اکبر (اللہ بڑا ہے) کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں بڑا نہیں ہوں۔ اِس طرح نماز، انسان کو تواضع (modesty) کے لیے تیار کرتی ہے، اور بلا شبہ تواضع موجودہ دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ قدر انسانی صفت ہے۔ فرض نمازیں مسجد میں باجماعت پڑھی جاتی ہیں۔ باجماعت نماز میں یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کو بطور امام آگے کھڑا کر کے سب لوگ اس کے پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اِس طرح نماز یہ سبق دیتی ہے کہ ایک انسان کو آگے کر کے سب لوگ پیچھے کی سیٹ (back seat) پر چلے جائیں۔ یہ طریقہ بلا شبہ تواضع کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ نماز کا خاتمہ 'السّلام علیکم ورحمۃ اللہ' پر ہوتا ہے، یعنی تمام انسانوں کے لیے امن کی اسپرٹ لے کر مسجد کے باہر جانا۔ گویا کہ نماز ایک طرف تواضع کی صفت پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف امن پسندی کی صفت۔ یہ صرف نماز کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ اسلام اپنے ماننے والوں کو زندگی کے ہر موڑ پر تواضع اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

تواضع کی صفت بلا شبہ موجودہ دنیا میں بہتر سماج بنانے کا سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ ہے۔ زمین کے اوپر شکر، صبر، تواضع اور قناعت کے ساتھ رہنا زمین کی اصلاح ہے۔ اس کے برعکس، ناشکری، بے صبری، گھمنڈ اور حرص کے ساتھ رہنا زمین میں فساد برپا کرنا ہے۔ کیوں کہ اس سے خدا کا قائم کیا ہوا فطری نظام ٹوٹتا ہے۔ یہ اللہ کی قائم کردہ حدود سے نکل جانا ہے۔ جب کہ اللہ چاہتا ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد اس کی متعین کی ہوئی حدود کے اندر رہ کر زندگی گزارے۔

سوال کی کثرت

صحابی رسول وابصہ بن معبد الاسدی کا ایک واقعہ حدیث کی کتابوں میں آیا ہے۔ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ وہ آپ سے نیکی اور بدی کے تمام سوالات پوچھنا چاہتے تھے (لَا أَدَعُ شَيْئًا مِنَ الْبِرِّ وَالْإِثْمِ إِلَّا سَأَلْتُهُ عَنْه)۔ رسول اللہ نے ان کے سوالات کا جواب نہیں دیا، بلکہ یہ کہا اپنے دل سے فتوی پوچھو، اور اپنے آپ سے فتوی پوچھو (یہ بات آپ نے تین بار کہی، اس کے بعد کہا) نیکی وہ ہے جس پر تمھارا دل مطمئن ہو، اور بدی وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے، اور تمھارے دل میں تردد پیدا ہو، خواہ لوگ اس کے بارے میں تمہیں کوئی بھی فتوی دیں۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 18006)

یہ صرف ایک صحابی کا واقعہ نہیں ہے، بلکہ اس میں تمام اہل ایمان کے لیے رہنمائی ہے۔ رسول اللہ نے سوال کا جواب کیوں نہیں دیا۔ کیوں کہ بہت زیادہ سوال آدمی کو ڈسٹریکشن کی طرف لے جاتا ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس کے بجائے ان کو تدبر و تفکر پر ابھارا۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر آدمی ہر معاملے میں اپنا مفتی خود بن جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسئلے کو شرعی مسئلہ نہ بناؤ۔ کھلی ممنوعات کے سوا جو چیزیں ہیں، ان میں کامن سنس (common sense) پر عمل کرو۔

سوال یہ ہے کہ کنفیوژن کسی کو کیوں ہوتا ہے۔ میرے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ لوگوں کا دماغ زیادہ تر معلومات کا جنگل ہوتا ہے۔ وہ ایسا نہیں کر پاتے کہ تحلیل و تجزیہ (analysis) کر کے مختلف معلومات سے درست نتیجہ نکال سکیں۔ یعنی وہ متعلق اور غیر متعلق کا فرق سمجھیں۔ وہ بنیادی اور غیر بنیادی میں تمیز کر سکیں اور پھر مختلف معلومات کو ہضم کر کے صحیح نتیجہ نکالیں۔ اسی ناکامی کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کا معلوماتی ذخیرہ ان کو صرف کنفیوژن تک پہنچاتا ہے، وہ انہیں فکری پختگی عطا نہیں کرتا۔

اسلام میں سوال سے زیادہ تدبر اور تفکر پر زور دیا گیا ہے۔ حضرت خضر کے ساتھ پیغمبر موسی جب سفر پر روانہ ہوئے تو حضرت خضر نے اُن سے کہا: فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ (18:70)۔ یعنی تم مجھ

سے کسی چیز کے بارے میں سوال نہ کرنا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سوال نہ کرو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذہن میں کوئی سوال آئے تو پہلے غور وفکر کرو۔ غور وفکر کر کے آدمی پہلے اپنے آپ کو ذہنی اعتبار سے تیار کرتا ہے۔ سوال کا جواب وہی شخص درست طور پر سمجھتا ہے، جو پہلے سے اپنے آپ کو ایک تیار ذہن (prepared mind) بنا چکا ہو۔

اس حقیقت کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک صحابی کہتے ہیں: یَنْهَى عَنْ ... كَثْرَةِ السُّؤَالِ (مسند احمد، حدیث نمبر 18232)۔ یعنی رسول اللہ نے زیادہ سوال کرنے سے منع کرتے تھے۔ سوال کی کثرت سے منع کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سوال کرنا حرام ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی پہلے خود سوال کے تقاضے کو پورا کرے، اس کے بعد وہ سوال کرے۔

اس معاملے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ دوسروں سے سوال کرنے سے پہلے آدمی خود غور وفکر کرے۔ اس طرح اس کو ذہنی ارتقا (intellectual development) کا فائدہ حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذہن میں غیر معمولی صلاحیت پیدا کی ہے۔ یہ صلاحیت غور وفکر سے بڑھتی ہے۔ اپنے ذہن کو ترقی دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی مطالعہ اور غور وفکر کے ذریعہ اپنے ذہن کو تیار کرتا رہے۔ وہ اپنے اندر زیادہ سے زیادہ اخذ (grasp) کی صلاحیت پیدا کرے۔ وہ اپنے آپ کو اس قابل بنائے کہ کوئی شخص اس کے سوال کا جواب دے تو وہ اپنی طرف سے اس میں کچھ اضافہ کر سکے۔ حقیقی سوال کرنے والا وہ ہے جو جواب کو سن کر اس میں اپنی طرف سے اضافہ کر سکتا ہو۔

مذکورہ حدیث کا مطلب اگر لفظ بدل کر بیان کیا جائے تو وہ یہ ہوگا — سوال کیوں کرتے ہو۔ اگر تمھارے ذہن میں کوئی سوال آیا ہے تو پہلے خود اپنے ذہن کو استعمال کر کے اس کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ سوال کو صرف سوال نہ سمجھو، بلکہ اس کو اپنے ذہنی ارتقا کا ذریعہ بناؤ۔ کسی بات کو سن کر فوراً سوال کرنا، عجلت پسندی کی علامت ہے۔ کسی بات کو سن کر پہلے غور وفکر کرنا چاہیے۔ اگر غور وفکر سے وہ بات کی تہہ تک نہ پہنچے تو سمجھنا چاہیے کہ اس نے اپنے ذہن کو تیار کرنے میں کمی کی ہے۔ لہٰذا اس کو سب سے پہلے اپنے ذہنی ارتقا پر مزید توجہ دینی چاہیے۔

مقدمہ

مطالعۂ حدیث ترجمہ وتشریح مشکاۃ المصابیح

قرآن کے بعد اسلام کی تعلیمات کو جاننے کا دوسرا مستند ماخذ حدیث ہے۔ صحاح ستہ اور حدیث کی جو دوسری بنیادی کتابیں ہیں وہ زیادہ تر فنی انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ان سے استفادہ کرنا انہی لوگوں کے لیے آسان ہے جو عالم ہوں۔ چنانچہ محدثین نے ان کتابوں سے اخذ کرکے عام لوگوں کے استعمال کے لیے بہت سے مجموعے تیار کیے ہیں۔ ان مجموعوں کو انتخاب حدیث یا حدیث کے منتخبات کا نام دیا جاسکتا ہے۔

ان منتخب کتب حدیث میں غالباً سب سے زیادہ مقبولیت مشکاۃ المصابیح کو حاصل ہوئی۔ عمومی استعمال کے لیے بلاشبہ یہ ایک نہایت موزوں کتاب ہے۔ اسی لیے ہم نے مشکاۃ المصابیح کو زیر نظر کتاب کے لیے بطور بنیاد اختیار کیا ہے۔

مشہور مفسر اور محدث ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی (وفات 516ھ) نے منتخب احادیث پر مشتمل ایک کتاب تیار کی تھی جس کا نام انہوں نے مصابیح السنۃ رکھا۔ یہ کتاب نسبتاً مختصر تھی اور اس میں بعض دوسری فنی کمیاں موجود تھیں۔ مثلاً اس میں احادیث کی تخریج نہیں کی گئی تھی۔ مشکاۃ المصابیح نامی کتاب البغوی کی کتاب مصابیح السنۃ کا اضافہ شدہ ایڈیشن ہے۔ موجودہ مشکاۃ المصابیح میں البغوی کی کتاب کے مقابلہ میں 1511 حدیثیں زیادہ ہیں۔

صاحب مشکاۃ کا پورا نام ولی الدین، ابوعبداللہ، محمد بن عبداللہ الخطیب العمری التبریزی ہے۔ انہوں نے البغوی کی کتاب مصابیح السنۃ میں اضافہ اور تحقیق وتخریج کا کام کیا۔ اس بنا پر یہ کتاب بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ مشکاۃ المصابیح کے مؤلف کا سال ولادت متعین طور پر معلوم نہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب کی تکمیل پر اس کے آخر میں 737ھ تحریر کیا تھا۔ اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ 737ھ کے بعد کسی قریبی سال میں ان کی وفات ہوئی۔ تاریخ الحدیث میں ہے کہ آپ نے غالباً 740ھ میں وفات پائی (صفحہ نمبر 111)۔

مشکاۃ المصابیح کی شرح وترتیب پر بہت سے علماء نے کام کیا ہے۔ آخر میں دور جدید کے

مشہور محدث محمد ناصر الدین الالبانی (وفات 1999) نے ایک اہم کام انجام دیا۔ انھوں نے اپنے بعض رفقاء کی مدد سے مشکاۃ المصابیح کو از سر نو تحقیق اور ایڈٹ کیا۔ اس پر ضروری حاشیے لکھے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے مشکاۃ المصابیح میں وارد تمام حدیثوں کے سلسلہ وار نمبر قائم کیے۔ اس کے مطابق اس کتاب میں حدیثوں کی کل تعداد 6285 ہے۔

زیرِ نظر کتاب مطالعہ حدیث میں ہم نے مشکاۃ المصابیح کی منتخب حدیثوں کو لیا ہے۔ اور زیرِ تشریح حدیث کے اوپر اس کا وہ نمبر درج کیا جارہا ہے جو شیخ ناصر الدین الالبانی کے نسخہ میں موجود ہے۔ اس طرح جو شخص کسی حدیث کو اصل کتاب میں دیکھنا چاہے۔ وہ نمبر کی مدد سے فوراً اس میں اس کو دیکھ سکتا ہے۔ ہمارے سامنے مشکاۃ المصابیح کے اس ایڈیشن کا وہ نسخہ ہے جو 1985ء (1405ھ) میں المکتب الاسلامی، بیروت سے تین جلدوں میں چھپا ہے۔

ہر حدیث کے ساتھ اس کی شرح بھی درج کی جارہی ہے۔ تاہم یہ شرح آسان اسلوب اور غیر فنی انداز میں ہے۔ ہماری شرح کا مقصد صرف یہ ہے کہ حدیث کو عام انسانوں کے لیے قابل فہم بنایا جائے اور اس کے نصیحت والے پہلو کو نمایاں کیا جائے۔

مولانا انور شاہ کشمیری نے اپنی کتاب مشکلات القرآن میں کہا ہے کہ حدیث کی خدمت کا حق حافظ ابن حجر العسقلانی نے فتح الباری لکھ کر ادا کر دیا ہے (ماہنامہ الفرقان، اپریل 2004، صفحہ 9)۔ عام طور پر علما کا یہ خیال ہے کہ فتح الباری حدیث کی شرح کے موضوع پر ایک مکمل کتاب ہے۔ مگر یہ بات نصف صداقت ہے۔ جہاں تک حدیث کی فنّی تشریح کا تعلق ہے، بلا شبہ صحیح البخاری کی شرح فتح الباری کو ایک مکمل کتاب کہا جاسکتا ہے جو تیرہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ مگر حدیث کی تشریح کا ایک اور پہلو ہے۔ اس کو حدیث کی حکیمانہ تشریح کہا جاسکتا ہے۔ اس دوسرے پہلو سے ذخیرۂ احادیث کی تشریح کا کام ابھی تک باقی ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں علم حدیث کی اس کمی کو سادہ اور مختصر انداز میں پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مطالعۂ حدیث کی ترتیب کا یہ کام اللہ کی توفیق سے 28 مارچ 2000 کو شروع کیا گیا تھا۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اس مجموعہ کو لوگوں کے لیے مفید بنائے اور حدیث رسول سے تعلق میں مددگار ثابت ہو۔

نئی دہلی — وحید الدین

مطالعۂ حدیث

شرح مشکاۃ المصابیح

(حدیث نمبر 123-110)

110

مطر بن عکام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ کسی بندے کے لیے فیصلہ کرتا ہے کہ فلاں مقام پر اس کی موت ہو تو اس مقام پر وہ اس کے لیے کوئی ضرورت رکھ دیتا ہے (مسند احمد، حدیث نمبر 21983؛ سنن الترمذی، حدیث نمبر 2146)۔

تشریح: خدا اپنی مصلحتوں کے تحت ہر مرد اور عورت کے لیے یہ فیصلہ فرماتا ہے کہ اس کو کتنے دن تک موجودہ دنیا میں رہنا ہے اور کس مقام پر اس کی وفات ہونے والی ہے۔ جب کسی کا وقت آتا ہے تو اس کے لیے ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں کہ وہ زمین کے اسی مقام پر پہنچ جائے جہاں اس کی موت مقدر تھی۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کو خالق نے ایک مقصد کے تحت پیدا کیا ہے، اور وہ ہر لمحہ اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ خالق کے اس منصوبۂ تخلیق کو جانے اور زندگی کی منصوبہ بندی میں آخری حد تک اس کی رعایت کرے، جس طرح وہ دنیا کے سفر میں منصوبہ بندی (planning) کا اہتمام کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ہر طرح غفلت کا شکار ہونے سے بچائے — جنت کسی انسان کو اسی عمل کی بنیاد پر ملے گی جو خالق کے منصوبۂ تخلیق کے مطابق ہو، نہ کہ کسی خود ساختہ عمل یا خوش فہمیوں کی بنیاد پر۔

111

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ اے خدا کے رسول مومنوں کی اولاد کا کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ اپنے باپوں کے تابع ہیں۔ میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا کسی عمل کے بغیر۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ خوب جانتا ہے جو وہ کرنے والے تھے۔ پھر میں نے کہا کہ مشرکین کی اولاد کا کیا حکم

ہے۔آپ نے فرمایا کہ وہ اپنے باپوں کے تابع ہیں۔میں نے کہا کہ کیا کسی عمل کے بغیر۔آپ نے فرمایا اللہ خوب جانتا ہے جو وہ کرنے والے تھے۔(سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4712)

تشریح: اس حدیث میں مذکورہ مسئلہ کا عمومی حکم بتایا گیا ہے۔نابالغ بچوں کے بارے میں درست بات وہ ہے، جو ابن عبد البر نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے بیان کی ہے۔ حضرت عائشہ کے مطابق، حضرت خدیجہ نے مشرکین کی اولاد کے تعلق سے پوچھا تو آپ نے کہا کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ ہوں گے، پھر اس کے بعد ان سے پوچھا گیا تو آپ نے کہا کہ اللہ تعالی خوب جانتا ہے کہ وہ کیا کرنے والے تھے، پھر اس کے بعد پوچھا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى (6:164)۔یعنی، اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔چنانچہ آپ نے کہا کہ وہ فطرت پر ہیں، تو وہ جنت میں ہوں گے (هُمْ عَلَى الْفِطْرَةِ وَهُمْ فِي الْجَنَّةِ)۔ الاستذکار لابن عبد البر، جلد 3، صفحہ 113۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جنت میں دیکھا، آپ نے دیکھا کہ ان کے اردگرد بہت بڑی تعداد میں چھوٹے چھوٹے بچے موجود ہیں۔ان کے بارے میں آپ نے کہا: وَأَمَّا الوِلْدَانُ الَّذِينَ حَوْلَهُ فَكُلُّ مَوْلُودٍ مَاتَ عَلَى الفِطْرَةِ، قَالَ: فَقَالَ بَعْضُ المُسْلِمِينَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، وَأَوْلاَدُ المُشْرِكِينَ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَأَوْلاَدُ المُشْرِكِينَ۔(صحیح البخاری، حدیث نمبر 1386؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2275)۔یعنی یہ وہ بچے ہیں، جن کا انتقال فطرت پر ہوا ہے۔تو کچھ مسلمانوں نے کہا: اے اللہ کے رسول، مشرکین کی اولاد بھی ان میں ہیں۔آپ نے کہا: ہاں، مشرکین کی اولاد بھی۔

امام النووی نے کہا ہے کہ دنیا میں مشرکین اور منکرین کی اولاد کا حکم وہی ہے جو ان کے والدین کا حکم ہے (أَنَّ أَوْلَادَ الْكُفَّارِ حُكْمُهُمْ فِي الدُّنْيَا حُكْمُ آبَائِهِمْ)، لیکن آخرت کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ اگر وہ بالغ ہونے سے پہلے انتقال کر جائیں تو جنت میں ہوں گے۔(شرح صحیح مسلم، جلد 12، صفحہ 50)

112

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زندہ گاڑنے والی اور زندہ گاڑی ہوئی دوزخ میں ہیں۔ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4717)

تشریح: اس حدیث کی وضاحت قرآن کی دو آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے سمجھ میں آتی ہے۔ وہ آیت یہ ہے: وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۔ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (81:8-9)۔ یعنی، اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی۔

اسلام کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ ایک شخص کے عمل کی سزا دوسرے شخص کو نہیں دی جاسکتی۔ اللہ تعالیٰ کسی کا فیصلہ اس کے ذاتی عمل کی بنیاد پر کرے گا۔ اس لیے بظاہر یہ ناقابل قیاس ہے کہ گاڑی جانے والی بے قصور بچی کو گاڑنے والے (خواہ مرد یا عورت) کے جرم میں شامل کیا جائے۔ غالباً یہاں کلام کا رخ گاڑنے والے کی طرف ہے، مگر شدت غضب کی بنا پر کلام کا مذکورہ انداز اختیار کیا گیا۔

113

ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اپنی مخلوق میں ہر بندہ کے متعلق پانچ چیزوں سے فارغ ہو چکا ہے۔ اس کی موت سے اور اس کے عمل سے اور اس کے ٹھکانے سے اور اس کے نشان قدم سے اور اس کے رزق سے۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 21722)

تشریح: اس حدیث میں جن پانچ چیزوں کا ذکر ہے ان کا تعلق دراصل ان امتحانی پرچوں سے ہے جن میں ہر آدمی کا امتحان لیا جانا مقدر ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اس بحث میں نہ پڑے کہ اس کو کون سا پرچہ ملا اور کون سا نہیں ملا۔ اس کو چاہیے کہ وہ اپنا پورا دھیان صرف اِس پہلو پر لگائے کہ جو امتحانی پرچے اس کے لیے مقدر کیے گئے ہیں ان کو وہ کامیابی کے ساتھ حل کر سکے۔ اِس دنیا میں کامیابی کا راز یہ نہیں ہے کہ آدمی مادّی ساز و سامان اپنے گرد اکٹھا کر لے۔ یہاں کامیابی کا راز یہ

ہے کہ آدمی کو امتحان کا جو پرچہ دیا گیا ہے اس پرچے کو حل کرنے میں وہ کامیاب ہو جائے۔" نشان قدم" یعنی دنیا میں کس کس جگہ انسان اپنا قدم رکھے گا۔

114

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: جو آدمی تقدیر میں کسی چیز پر بحث کرے گا اس کے بارے میں اس سے قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔ اور جو تقدیر کے معاملے میں بحث نہیں کرے گا اس سے اس کی بابت سوال نہیں ہوگا۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 83)

تشریح: انسان اپنی محدودیت کی بنا پر تقدیر کے معاملے میں حتمی رائے نہیں قائم کرسکتا۔ ایسی حالت میں جو آدمی خوض سے بچے اور اجمالی علم پر قناعت کرے تو وہ آخرت کی پکڑ سے بچ گیا۔ اور جو آدمی اس معاملے میں خوض اور بحث کرکے حتمی رائے تک پہنچنا چاہے وہ دنیا میں ذہنی پراگندگی میں مبتلا ہوگا اور آخرت میں اس جرم میں پکڑا جائے گا کہ اس نے اپنی فطری محدودیت کا اعتراف نہیں کیا اور بے فائدہ طور پر ایسی بحثوں میں پڑا جن کا جواب معلوم کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہ تھا۔

115

ابن الدیلمی (تابعی) کہتے ہیں کہ میں ابی ابن کعب کے پاس گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے دل میں تقدیر کے بارے میں کچھ شک پیدا ہو گیا ہے۔ پس آپ مجھے کوئی بات بتائیں۔ شاید اللہ اس کو میرے دل سے نکال دے۔ انھوں نے کہا کہ اگر اللہ تعالی اپنے آسمان کے لوگوں کو اور اپنی زمین کے لوگوں کو عذاب دے تو وہ اس عذاب پر ان کے حق میں ظالم نہ ہوگا اور اگر وہ ان پر رحم فرما دے تو اس کی رحمت یقیناً ان کے اعمال سے بہتر ہے۔ اور اگر تم احد پہاڑ کے برابر سونا صدقہ کرو تو اللہ تم سے اس صدقہ کو قبول نہیں کرے گا، یہاں تک کہ تم تقدیر پر ایمان لاؤ اور تم یہ جانو کہ جو تمہیں پہنچا وہ تم سے رک نہیں سکتا تھا اور جو تم سے رک گیا وہ تم کو پہنچ نہ سکتا تھا اور اگر تم اس کے سوا کسی اور چیز پر مرے تو دوزخ میں جاؤ گے۔ وہ کہتے ہیں کہ پھر میں

عبداللہ بن مسعود کے پاس گیا تو انھوں نے بھی ایسی ہی بات کہی۔ پھر حذیفہ بن الیمان کے پاس گیا تو انھوں نے بھی ایسی ہی بات کہی۔ پھر میں زید بن ثابت کے پاس گیا تو انھوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کی حدیث بیان کی۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 21589؛ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4699؛ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 77)

تشریح: اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ بندوں کی نسبت سے ہے۔ بندوں کو چاہیے کہ وہ اس حقیقت کا مکمل اعتراف کریں کہ ان کا رب قادر مطلق ہے۔ انسان کو اس کے رب کی طرف سے اتنی زیادہ نعمتیں ملی ہوئی ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ اس کا حق بندوں کے اوپر اتنا زیادہ ہے کہ وہ بندوں کے ساتھ جو معاملہ بھی کرے وہ اس کی طرف سے ظلم نہ ہوگا۔ اس قسم کا عقیدہ ایمان باللہ کا ایک لازمی تقاضہ ہے۔ تاہم جہاں تک خدا کا تعلق ہے، اس کی شانِ کمال کا یہ بھی ایک پہلو ہے کہ اس نے یہ فیصلہ فرما دیا ہے کہ اس کی رحمت اس کے غضب کے اوپر غالب رہے گی: وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (7:156)۔ اس لیے اگر کسی نے غلط عمل نہ کیا ہو تو وہ اس کو ناحق نہیں پکڑے گا۔

116

نافع تابعی کہتے ہیں کہ ایک آدمی عبداللہ ابن عمر کے پاس آیا۔ پھر اس نے کہا کہ فلاں شخص نے آپ کو سلام کہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ اس نے دین میں نئی بات نکالی ہے۔ پس اگر اس نے دین میں نئی بات نکالی ہے تو میری طرف سے اس کو سلام نہ پہنچانا۔ کیوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت میں — یا یہ کہ — اس امت میں خسف (دھنس جانا) اور مسخ (چہرہ بگڑ جانا) اور قذف (پتھر برسنا) ہوگا تو وہ اہل قدر پر ہوگا۔ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 1252؛ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4613؛ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4061)

تشریح: مذکورہ صحابی نے جو بات کہی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایسے لوگوں سے سلام وکلام نہ کیا جائے۔ صحابی کا قول ہیمرنگ (hammering) کے انداز میں اظہارِ بے زاری کے لیے

ہے، نہ کہ سلام کا مسئلہ بتانے کے لیے۔ تقدیر کے معاملے میں مجمل ایمان کا حکم دیا گیا ہے۔ جو شخص اس معاملے میں مجمل علم پر نہ رکے بلکہ اس معاملے میں کُلّی علم تک پہنچنے کے لیے غیر ضروری بحث و مباحثہ میں پڑے، وہ نہ صرف لوگوں کے درمیان کنفیوزن پھیلانے کا جرم کر رہا ہے، بلکہ وہ بدعت کا فعل بھی کر رہا ہے اور بدعت اسلام میں بہت بڑا جرم ہے۔

117

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ نے آدم کو پیدا کیا تو اس نے ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ پھر ان کی پشت سے وہ تمام جانیں باہر نکل آئیں جن کو اللہ ان کی نسل سے قیامت تک پیدا کرنے والا تھا۔ پھر اللہ نے ان میں سے ہر انسان کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک چمک رکھی۔ پھر ان سب کو آدم کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اے میرے رب یہ کون لوگ ہیں۔ فرمایا کہ تمہاری اولاد۔ آدم نے ان میں سے ایک کو دیکھا تو اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کی چمک ان کو بہت اچھی لگی۔ انھوں نے کہا کہ میرے رب یہ کون ہے۔ فرمایا کہ داؤد۔ انھوں نے کہا کہ اے میرے رب، تو نے اس کی عمر کتنی رکھی ہے۔ فرمایا کہ ساٹھ سال۔ انھوں نے کہا کہ میری عمر سے چالیس سال لے کر اس کی عمر میں اضافہ کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب آدم کی عمر میں چالیس سال رہ گئے تو موت کا فرشتہ ان کے پاس آیا۔ آدم نے کہا کہ کیا میری عمر پوری ہونے میں چالیس سال باقی نہیں ہیں۔ فرشتہ نے کہا کہ کیا آپ نے اپنی عمر کے چالیس سال اپنے بیٹے داؤد کو نہیں دے دیے تھے۔ لیکن آدم نے انکار کیا تو ان کی اولاد بھی انکار کرتی ہے، آدم بھول گئے تو ان کی اولاد بھی بھولتی ہے۔ آدم نے خطا کی تو ان کی اولاد بھی خطا کرتی ہے۔ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3076)

تشریح: اس حدیث جس واقعہ کا ذکر ہے اس کا تعلق بظاہر غیبی امور سے ہے۔ لیکن اس واقعہ کے ریفرنس میں انسان کی فطری کمزوریوں کو بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً بھولنا، غلطی کرنا، وغیرہ۔ انسان ان فطری کمزوریوں پر قابو نہیں پا سکتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے یہ دروازہ بھی کھول دیا ہے کہ جب بھی اس سے کوئی غلطی یا بھول چوک ہو جائے، اور اس کو اس بات کا

احساس ہوجائے تو وہ توبہ اور ندامت کا طریقہ اختیار کرے، جیسا کہ اس کے باپ آدم نے کیا تھا (البقرہ، 2:37)۔ وہ ایسا ہرگز نہ کرے کہ غلطی کے ارتکاب کے بعد اکڑ اور سرکشی میں پڑ جائے۔ اکڑ اور سرکشی ابلیس کا طریقہ ہے۔

غیبی امور کے بارے میں صحیح مسلک یہ ہے کہ ان کو جیسا ہے ویسا ہی مان لیا جائے۔ ان میں خوض اور تعمق سے پرہیز کیا جائے۔

118

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے آدم کو پیدا کیا اور جب ان کو پیدا کرلیا تو اس نے ان کے دائیں مونڈھے پر مارا۔ اس سے سفید اولاد نکالی۔ یہ سب چیونٹیوں کی مانند تھے۔ پھر اس نے ان کے بائیں کندھے پر مارا اور اس سے سیاہ اولاد نکالی۔ وہ گویا کہ کوئلہ تھے۔ پھر داہنے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ جنت کی طرف ہیں۔ اور مجھ کو پرواہ نہیں۔ اور بائیں کندھے والوں کے متعلق فرمایا یہ دوزخ کی طرف ہیں، اور مجھ کو پرواہ نہیں (مسند احمد، حدیث نمبر 27488)۔

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی نسل کی تخلیق باقاعدہ منصوبے کے تحت ہوئی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اس منصوبے کو سمجھے اور اس کی تعمیل کرکے اس کامیابی کو حاصل کرلے جو اس کے خالق نے اس کے لیے مقدر کی ہے۔ اس منصوبۂ تخلیق کا مرکزی کردار انسان ہے، اور تخلیق کی منزل جنت (Paradise) ہے۔ جو کہ انسان کے لیے معیاری دنیا (ideal world) ہے۔ آغاز سے اختتام تک یہ ایک لمبا سفر ہے، جو مختلف مراحل سے گزرتا ہے، اور آخر کار وہ ابدی جنت تک پہنچتا ہے۔

خالق نے اپنے تخلیقی نقشہ کے مطابق، اُس دنیا کو ایک جوڑا دنیا (pair world) کی شکل میں بنایا ہے۔ ایک وہ دنیا جس میں ہم پیدا ہونے کے بعد رہتے ہیں۔ دوسری وہ دنیا جہاں ہم موت کے بعد چلے جاتے ہیں۔ انسانوں کو اُس کے پیدا کرنے والے نے ایک ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ مگر اُس نے اس کی زندگی کو دو مرحلوں میں تقسیم کردیا ہے۔ قبل از موت دور اور بَعد از

موت دور۔ موت سے پہلے کی دنیا آزمائشی مقام (testing ground) کے طور پر بنائی گئی ہے اور موت کے بعد کی دنیا دارُالجزاء (world of reward) کے طور پر۔

موجودہ دنیا چوں کہ ٹسٹ کے لیے بنائی گئی ہے اس لیے یہاں ہر عورت و مرد کو آزادی حاصل ہے۔ مگر یہاں دنیا میں موجود ہر چیز ناقص اور محدود صورت میں ہے۔ گویا کہ موجودہ دنیا ایک قسم کا اگزامینیشن ہال (examination hall) ہے۔ یہاں ٹسٹ دینے کے بقدر ضروری سامان موجود ہیں مگر پُرمسرت زندگی گزارنے کے لیے جو اعلیٰ چیزیں درکار ہیں وہ یہاں موجود نہیں۔ اگزامنیشن ہال کے اندر کوئی طالب علم اپنی مطلوب زندگی کی تعمیر کرنا چاہے تو اس کو صرف مایوسی ہوگی۔ یہی مایوسی ان لوگوں کو ہو رہی ہے جو موجودہ ٹسٹ کی دنیا میں اپنے مطلوب مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ قبل از موت دنیا میں کسی عورت یا مرد کو کیا کرنا ہے کہ وہ بعد از موت دنیا میں اپنی مطلوب دنیا (desired world) پا سکے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنی آزادی کو خالق کے منشا کے مطابق استعمال کرے۔

119

ابونضرہ تابعی کہتے ہیں کہ اصحاب رسول میں سے ایک شخص جن کا نام ابوعبداللہ تھا، ان کے پاس ان کے اصحاب عیادت کے لیے آئے۔ اس وقت وہ رو رہے تھے۔ انھوں نے ان سے پوچھا کہ تم کو کیا چیز رلا رہی ہے۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے یہ نہ کہا تھا کہ اپنی مونچھیں کٹواؤ پھر اس کے پابند رہو یہاں تک کہ مجھ سے مل جاؤ۔ انھوں نے کہا کہ ہاں مگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالی نے (اپنی مخلوق میں سے) ایک حصے کو اپنے داہنے ہاتھ کی مٹھی میں لیا اور (باقی) دوسرے حصے کو دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں لیا۔ اور فرمایا کہ یہ اِس کے لیے ہے اور یہ اُس کے لیے ہے اور مجھ کو پرواہ نہیں۔ ابوعبداللہ صحابی نے کہا: اور میں نہیں جانتا کہ میں دونوں میں سے کس مٹھی میں ہوں۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 17593)

تشریح: ''یہ اِس کے لیے ہے اور یہ اُس کے لیے ہے (هذه لهذه، وهذه لهذه)'' کا مطلب یہ ہے کہ دائیں مٹھی والے جنت کے لیے ہیں اور بائیں مٹھی والے جہنم کے لیے۔ اس

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سچا مومن امید اور خوف کے درمیان جیتا ہے۔ کھلی بشارت بھی اس کی اس اندیشہ ناک حالت کو ختم نہیں کرتی۔ ایمان اللہ کی محبت اور خوف کا ایک ایسا مقام ہے جس میں آدمی اللہ سے ڈرتا ہے مگر اسی کی طرف بھاگتا ہے، اسی سے خوف محسوس کرتا ہے مگر وہ اسی سے پانے کی امید بھی رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا اضطراب ہے جو سراپا اطمینان ہے اور ایسا اطمینان ہے جو سراپا اضطراب ہے۔ یہی وہ نفسیاتی حالت ہے جو مومن کے کردار کی تشکیل کرتی ہے۔ اللہ رب العالمین کی معرفت اور اس کے منصوبۂ تخلیق کی دریافت انسان کے اندر امید اور خوف کی ایک ایسی ملی جلی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جس میں بندہ کبھی یہ طے نہیں کر پاتا کہ ان دونوں میں سے کس کو فوقیت دے۔ یہ سب کچھ کر کے اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنے کا وہ اعلیٰ ترین احساس ہے جس میں آدمی کو صرف اپنی ذمہ داریاں یاد رہتی ہیں اور اپنے حقوق کو وہ بالکل بھول جاتا ہے۔ صحابی رسول ابوعبداللہ کے الفاظ اسی حقیقت کا اظہار ہیں۔

120

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے آدم کی پشت (میں موجود تمام اولاد) سے نعمان (عرفہ) میں عہد لیا۔ اس نے آدم کی پیٹھ سے ان کی ساری اولاد نکالی۔ پھر ان کو آدم کے سامنے چیونٹیوں کی طرح بکھیر دیا۔ پھر ان سے روبرو کلام کیا۔ فرمایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا ہاں، ہم گواہ ہیں۔ تاکہ تم لوگ قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم اس سے غافل تھے۔ یہ کہو کہ شرک تو ہمارے باپ داداؤں نے کیا، ہم تو ان کے بعد کی نسل سے ہیں۔ کیا تو ہم کو اس پر ہلاک کرے گا ہے جو باطل پرستوں نے کیا۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 2455)

تشریح: اس حدیث میں جس معاملے کا ذکر ہے اس کا مطلب، دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں خالق کا شعور پیدائشی طور پر رکھ دیا گیا ہے۔ اگر بالفرض کچھ لوگوں تک خدا کے دین کی دعوت براہِ راست طور پر نہ پہنچے تب بھی مذکورہ معاملے کی صورت میں وہ بالواسطہ طور پر ہر ایک کو پہنچ چکی ہے۔ اس بنا پر کسی بھی شخص کے لیے آخرت کی باز پرس سے بچنا ممکن نہیں۔

ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے قرآن کی آیت: اور جب تمہارے رب نے اولاد آدم کی پشتوں سے ان کی ذریت کو باہر نکالا.... (7:172) کی تشریح میں کہا کہ اللہ نے ان کو جمع کیا پھر ان کو گروہ گروہ کیا۔ پھر انھیں صورت اور گویائی دی۔ پھر وہ بولے۔ پھر اللہ نے ان سے عہد اور میثاق لیا اور ان کو خود ان کے اوپر گواہ بنایا۔ اللہ نے کہا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ فرمایا کہ میں تمہارے اوپر سات آسمانوں اور سات زمینوں کو اور تمہارے والد آدم کو گواہ بناتا ہوں۔ تاکہ تم قیامت میں یہ نہ کہو کہ ہم کو اس کی خبر نہ تھی۔ جان لو کہ میرے سوا کوئی اور معبود نہیں اور نہ میرے سوا کوئی رب ہے۔ اور تم میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرانا۔ میں تمہارے پاس اپنے رسول بھیجوں گا۔ وہ تم کو میرا عہد اور میثاق یاد دلائیں گے۔ اور میں تمھارے اوپر اپنی کتابیں اتاروں گا۔ انھوں نے کہا کہ ہم گواہ ہیں کہ تو ہمارا رب ہے اور تو ہمارا معبود ہے۔ تیرے سوا کوئی اور ہمارا رب نہیں۔ پس انھوں نے اس کا اقرار کیا۔ اور آدم کو ان کے اوپر بلند کیا گیا۔ انھوں نے ان سب کو دیکھا۔ چنانچہ انھوں نے (ان کے درمیان) امیر اور فقیر اور خوب صورت، اور بدصورت دیکھے۔ تو آدم نے کہا کہ اے میرے رب تو نے اپنے بندوں کے درمیان برابری کیوں نہ رکھی۔ اللہ نے کہا کہ میں نے یہ چاہا کہ میرا شکر ادا کیا جائے۔ اسی طرح آدم نے ان کے درمیان پیغمبروں کو چراغوں کی مانند دیکھا، ان پر نور تھا۔ ان سے دوسرا خصوصی عہد رسالت اور نبوت کے متعلق لیا گیا۔ اس عہد کو اللہ تعالی نے قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے: اور جب ہم نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا اور تم سے اور نوح سے اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے (33:7)۔ عیسیٰ بھی انھیں روحوں میں تھے ان کو مریم کی طرف بھیجا۔ حضرت اُبی بیان کرتے ہیں عیسیٰ کی روح مریم کے منہ سے ان کے جسم میں داخل ہوئی تھی۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 21232)

تشریح: پیغمبروں کا کام یاد دہانی ہے۔ خدا کو جو دین مطلوب ہے، اس کو پیشگی طور پر ہر انسان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے۔ پیغمبر یا ان کی تبعیت میں داعی اس لیے اٹھتے ہیں تاکہ لوگوں کو

ان کا فطری سبق یاد دلائیں اور ان کو اس عہد پر قائم ہونے کی تلقین کریں جو انھوں نے پیشگی طور پر اپنے رب سے لیا ہے۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی فطرت کو آلودہ ہونے سے بچائے تاکہ وہ حق کی آواز کو سنتے ہی فوراً پہچان لے، اور حق کا ساتھی بن جائے۔

122

ابو درداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے واقع ہونے والی چیزوں کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس کو مان لینا۔ لیکن اگر تم یہ سنو کہ کسی شخص کی جبلّت بدل گئی ہے تو تم اس کو ہرگز نہ ماننا۔ کیوں کہ جو شخص جس جبلّت کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے وہ اسی کی طرف جائے گا۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 27499)

تشریح: اصل یہ ہے کہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان ہمیشہ فرق (difference) رہتا ہے۔ کوئی بھی دو انسان یکساں نہیں ہو سکتے۔ خالق نے ہر مرد اور ہر عورت کو مسٹرڈ فرنٹ اور مز ڈ فرنٹ کے روپ میں پیدا کیا ہے۔ ڈفرینس خود فطرت کا لازمی حصہ ہے اور جب دو ڈفرنٹ لوگ باہم ملیں تو کامیاب زندگی کی ضمانت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ کر کے زندگی گذاریں۔ اس معاملہ میں فریقین کے لیے ایڈجسٹمنٹ کے سوا کوئی اور آپشن (option) نہیں۔

یہ ایک تنوّع (diversity) کا معاملہ ہے اور وہ ایک عظیم نعمت ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ دو شخصوں کے درمیان تبادلۂ خیال ہو اور ان کے اندر ذہنی ارتقاء کا عمل جاری ہو۔ اختلاف رائے پر مبنی تبادلۂ خیال کے فائدے بے شمار ہیں۔ اِس کے ذریعے انسان کو موقع ملتا ہے کہ وہ دوسرے کے فکری نتیجہ سے فائدہ اٹھائیں۔ اِس سے زیرِ بحث مسئلہ کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں، اِس سے انسان کی تخلیقی فکر میں اضافہ ہوتا ہے۔

اس لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ انسانی ذہن کے فطری فرق کو جان کر اس کا مثبت طریقے سے استعمال کیا جائے، نہ کہ اس کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔ اگر فریقین میں مثبت مزاج ہو تو ڈفرینس

سے انٹلیکچول ایکسچینج پیدا ہوگا اور اس ایکسچینج سے انٹیلیکچول ڈیولپمنٹ کا عمل جاری ہوگا۔ یہی کسی قوم کی ترقی کا سب سے بڑا راز ہے۔ اس کے برعکس، کسی سماج یا گروہ میں تنوّع کو ممنوع (taboo) قرار دینا صرف اِس قیمت پر ہوتا ہے کہ وہ سماج یا گروہ جمود (stagnation) کا شکار ہو جائے۔

123

ام سلمہ رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں کہ میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول آپ کو ہر سال اس زہریلی بکری کا اثر معلوم ہوتا ہے جو آپ نے کھائی تھی۔ فرمایا: مجھے اس کے سوا کچھ نہیں پہنچتا جو میرے مقدر میں اس وقت لکھ دیا گیا جب آدم اپنی مٹی میں (تیاری کے مرحلہ میں) تھے (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3546)۔

تشریح: موجودہ دنیا امتحان کی مصلحت کے تحت چل رہی ہے۔ یہاں جو کچھ کسی کے ساتھ پیش آتا ہے وہ اسی مصلحت کے تحت پیش آتا ہے۔ مثال کے طور پر یہودی کا رسولِ خدا کو زہر دینا اور آپ کا اس زہر کو انجانے میں کھا لینا غالباً اس لیے تھا کہ یہودیوں کی اخلاقی حالت کو آخری حد تک برہنہ کیا جائے، تاکہ کھلے طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ ان کو جو سزا دی جا رہی ہے وہ فی الواقع اس کے مستحق ہیں۔ اس واقعہ کا تعلق یہودیوں کو ڈسکریڈٹ کرنے سے تھا، نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مذکورہ خوراک کھلانے سے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں تمام انسانوں کے لیے ایک اہم رہنمائی موجود ہے۔ یعنی منفی سوچ سے ذہن کو کیسے ڈائیورٹ (divert) کیا جائے۔ چنانچہ ایک صاحب سے اَنا (ego) کے موضوع پر میری گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ ایگو کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ البتہ اُس کو ڈیفیوز (diffuse) کیا جا سکتا ہے، یہی اسلام کا طریقہ ہے۔ اسلام آدمی کی سوچ کے اندر میں ایک انقلاب لاتا ہے۔ یہ سوچ اس بات کی ضامن بن جاتی ہے کہ جب بھی آدمی کی اَنا بھڑکے تو اُس کی ربانی سوچ متحرک ہو کر اُس کی انا کے بم کو ڈیفیوز کر دے۔ میں نے کہا کہ اَنا (ایگو) کوئی برائی نہیں، وہ ایک طاقت ہے۔ آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ اپنے ذہن کو اتنا زیادہ ترقی دیں کہ وہ اَنا کو صرف اچھے استعمال میں لے، وہ اُس کو برے استعمال تک نہ جانے دے۔

سی پی ایس کا مشن

ایک حدیثِ رسول مسند امام احمد میں ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے: عَن جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: إِنَّ النَّاسَ دَخَلُوا فِي دِينِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا، وَسَيَخْرُجُونَ مِنْهُ أَفْوَاجًا (مسند احمد، حدیث نمبر 14696)۔ یعنی صحابی رسول جابر بن عبد اللہ نے کہا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو گئے عنقریب اسی طرح فوج در فوج وہ اس سے نکل جائیں گے۔

ایک شارح نے اس کی تشریح میں یہ الفاظ لکھے ہیں: وَذَلِكَ فِي آخر الزَّمَان عِنْد وجود الأشراط (التیسیر بشرح الجامع الصغیر، جلد 1، صفحہ 303)۔ یعنی یہ آخری زمانے میں ہوگا، قیامت کی نشانیوں کے وجود میں آنے کے وقت۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث دو ادوار سے تعلق رکھتی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دورِ شرک تھا۔ اس وقت رسول اور اصحاب رسول کی دعوتی جدوجہد سے لوگ بڑی تعداد میں شرک سے نکل کر توحید کی طرف آئے۔

اس کے بعد وہ دور آیا، جس کی پیشگی اطلاع ان الفاظ میں کی گئی تھی: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ یعنی عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں اور انفس میں۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ حق ہے۔ اس دور میں اہل اسلام کو یہ کرنا تھا کہ وہ آفاق و انفس کے دلائل (بہ الفاظ دیگر سائنسی دلائل) کو استعمال کرتے ہوئے لوگوں کو دوبارہ توحید پر قائم کریں۔ مگر مسلمانوں نفرتِ مغرب کی وجہ سے اُس دور کو سمجھ نہیں سکے، اور پوری شدت کے ساتھ اس کے مخالف بن گئے، اور منفی ذہن کے ساتھ ٹکراؤ میں مشغول ہو گئے۔

ابتدائے اسلام میں واقعہ یہ ہوا کہ لوگ شرک سے نکل کر توحید میں آئے۔ اس کے بعد ایک نیا دور آیا، یعنی سائنس کا دور۔ لیکن جب سائنسی زمانہ آیا تو توحید اور شرک کا مساوات (equation) بدل چکا تھا۔ اب توحید کے مقابلے میں شرک نہیں تھا، بلکہ توحید کے مقابلے میں

انکارِ خدا یعنی الحاد کا زور تھا۔ اس وقت کرنے کا کام یہ تھا کہ الحاد کے مقابلے کے لیے مائنڈ کو ایڈریس کرنے والا مضبوط لٹریچر تیار کیا جاتا۔ تاکہ اگر جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن میں مذہب کے خلاف کوئی کنفیوزن ہو تو وہ دور جائے۔ لیکن برعکس طور پر ہمارے علما نے جدید تعلیم یافتہ لوگوں پر ارتداد کا فتویٰ لگا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ مذہب کے بارے میں کنفیوزن کا کیس تھے، وہ دین سے بیزاری کا کیس بن گئے۔

ہندستان کے ایک معروف عالم دین نے ایک کتاب شائع کی تھی، اس کا ٹائٹل تھا: ردۃ ولا ابابکر لھا (ایک ارتداد ہے، لیکن اس کے مقابلے کے لیے کوئی ابوبکر نہیں)۔ اس کتاب کے مصنف نے اس نئے دور کو ارتداد کا دور کہا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے لیے عملاً وہ بے خبری کا دور تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں پر شکایت اور نفرت کا ذہن غالب تھا۔ اس لیے وہ اس دور کو سمجھ نہیں سکے۔

یہ سائنس کا دور تھا، جس کو قرآن میں آفاق وانفس کے ظہور کا دور کہا گیا تھا۔ قرآن کے بیان کے مطابق، یہ دور دینِ حق کی تبیینِ مزید (41:53) کا دور تھا۔ مگر بے خبری کی بنا پر پوری مسلم کمیونٹی اس دور کو مخالفِ اسلام دور سمجھ کر اس میں پیدا شدہ مواقع کو اویل کرنے سے محروم ہو رہ گئی۔ حالاں کہ وہ دین کی سائنسی تبیین کا دور تھا۔ مندرجہ بالا حدیث کو جب قرآن کی اس آیت کے ساتھ ملا کر سمجھا جائے تو اس سے گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں شرک کا مقابلہ کرنے کے لیے مثبت طرز عمل اختیار کیا گیا تھا، یعنی دعوت کا طریقہ۔ جس سے لوگ فوج در فوج اسلام کی طرف آئے۔ یہی طریقہ الحاد کے مقابلے کے لیے اختیار کیا جائے، ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ فتویٰ لگا کر ایسے لوگوں کو دین سے دور کر دیا جائے۔

سی پی ایس انٹرنیشنل نے اس دور کو دریافت کیا، اور اس کی تردید کے بجائے دعوت کے نئے دور کے طور پر اس کو استعمال کیا۔ راقم الحروف نے بڑے پیمانے پر عصری اسلوب میں دعوتی لٹریچر تیار کیا ہے، جس کو سی پی ایس کے لوگ اردو، ہندی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں چھاپ کر وسیع پیمانے پر پھیلا رہے ہیں۔ سی پی ایس کے تحت یہ کام بڑے پیمانے پر انجام دیا جا رہا ہے۔

خواتین میں دعوت

عام طور پر ایسا ہے کہ لوگ دینی کام کے لیے کسی شخصیت کو اپنا رول ماڈل بنا لیتے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ ابن تیمیہ کو اپنا رول ماڈل بنائے ہوئے ہیں، اور کوئی غزالی کو رول ماڈل سمجھے ہوئے ہے، وغیرہ۔ پھر ہر ایک اپنے ماڈل کو واحد معیاری ماڈل مان کر اقدام کرتا ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کا گول اس کے لیے اچیوبیل (achievable) نہیں ہے تو شعوری یا غیر شعوری طور پر سمجھ لیتا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کرسکتا۔

دوسرے الفاظ میں وہ اپنے عمل کا آغاز عملی اقدام سے کرتا ہے، نہ کہ افراد کی ذہن سازی سے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی گہری تحریک کا صحیح آغاز یہ ہے کہ پہلے افراد کی ذہن سازی کی جائے، اور جب ذہن پوری طرح بن چکا ہو تو اس کے بعد عملی اقدام کیا جائے۔ ذہن سازی کے بغیر اقدام کرنے کا مطلب، بغیر تیاری کے اقدام کرنا ہے، اور جو اقدام تیاری کے بغیر کیا جائے اس کا انجام پیشگی طور پر معلوم ہے، اور وہ ہے مکمل ناکامی۔

الرسالہ مشن نے اس معاملے میں ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔ مز فہمیدہ خانم (پیدائش 1964) ایک سیدھی سادی گھریلو خاتون ہیں۔ وہ میری کتابیں مطالعہ کرتی ہیں، اور میری تقریریں سنتی ہیں، اور سی پی ایس کی ممبر ہیں۔ ایک مرتبہ ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ دعوت کا کام پوری طرح نہیں کر پا رہی ہیں۔ یہ سوچ ان کی زندگی کی انقلابی سوچ ثابت ہوئی۔ انھوں نے اس کے بعد دعا کی، اور اپنے تعلقات کی خواتین سے مل کر ایک واٹس ایپ گروپ بنایا، جس میں انھوں نے خواتین کے ساتھ الرسالہ مشن کی آئڈیالوجی کی بنیاد پر ڈسکشن شروع کیا۔

یہ خواتین واٹس ایپ کے ذریعے جمع ہوئیں۔ اس میں نہ صرف انڈیا بلکہ انڈیا کے باہر کی خواتین بھی شامل ہیں۔ یہ لوگ روزانہ آپس میں دین اور آدابِ زندگی کے تعلق سے پہلے ایک سوال رکھتی ہیں، جو ان کو روزمرہ کی زندگی میں پیش آیا ہو۔ پھر اس پر وہ آپس میں ڈسکشن کرتی ہیں۔ یہ ڈسکشن

قرآن وحدیث اور الرسالہ کے مضامین پر مبنی ہوتا ہے، یا ذاتی تجربات ومشاہدات پر۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کرتی ہیں کہ مہینہ میں ایک دن سی پی ایس اسکالرس ٹیم کے ساتھ سوال و جواب کی نشست رکھتی ہیں۔ اس سے ان کے بہت سے کنفیوزن دور ہوتے ہیں۔ اور دین کے بہت سے نئے گوشے کھلتے ہیں، اور ان کا انٹلکچول ڈیولپمنٹ ہوتا ہے۔

ٹیم کی ایک ممبر ڈاکٹر سفینہ تبسم (سہارن پور) نے ایک دن یہ تاثر دیا کہ آج میں ڈسکشن میں زیادہ حصہ نہیں لے سکی، مگر سارے میسجز کو پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ آج کے ڈسکشن سے میرا ٹیک اوے (takeaway) یہ ہے کہ میں اپنے اور اپنی فیملی کے اندر ایجوکیشن اور انٹلکچول ڈیولپمنٹ پر فوکس کروں گی، اور اس کام کو اس طرح آگے بڑھاؤں گی کہ وہ اگلی نسل تک چلتا رہے۔

اس گروپ میں پوری دنیا کی سو سے زیادہ خواتین شامل ہیں، جو اپنا انٹلکچول ڈیولپمنٹ کر رہی ہیں، اور دعوت کے کام کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ یہ واقعہ جب میں نے سنا تو مجھے ایک حدیثِ رسول یاد آئی۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: جُعِلَتِ الْأَرْضُ كُلُّهَا لِي وَلِأُمَّتِي مَسْجِدًا وَطَهُورًا فَأَيْنَمَا أَدْرَكَتْ رَجُلًا مِنْ أُمَّتِي الصَّلَاةُ فَعِنْدَهُ مَسْجِدُهُ وَعِنْدَهُ طَهُورُهُ (مسند احمد، حدیث نمبر 22137)۔ یعنی پوری زمین کو میرے لیے، اور میری امت کے لیے مسجد اور پاک بنادی گئی ہے۔ پس میری امت کے کسی فرد کے لیے جس مقام پر نماز کا وقت ہوجائے وہیں اس کے لیے نماز کی جگہ ہے اور وہیں اس کے لیے طہارت کا سامان۔

توسیعی اعتبار سے اس حدیث پر غور کیا جائے تو اس سے یہ خوش خبری معلوم ہوتی ہے۔ یعنی ایسا زمانہ آنے والا ہے، جب کہ مذہبی جبر کی حالت ختم ہوجائے گی، اور امت کے لیے پوری طرح یہ موقع ہوگا کہ وہ لوگ جس طرح مسجد میں آزادی کے ساتھ عبادت کرتے ہیں، اسی طرح آزادی کے ساتھ دنیا میں ہر جگہ عبادت اور دعوت کا کام انجام دے سکیں گے۔ یہاں تک کہ انٹرنیٹ کی ورچول دنیا (virtual world) میں بھی، یعنی فیس بک اور واٹس ایپ وغیرہ پر بھی۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ بآسانی رابطہ قائم کرنا ان کے لیے ممکن ہوجائے گا۔ سی پی ایس خواتین کا یہ کام بلاشبہ قابلِ تعریف ہے۔ ہر ایک عورت اور ہر ایک مرد موجودہ دور میں اس طرح دینی مشن کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔

جنت ماں کے قدموں کے نیچے

اسلام میں ماں (mother) کو بہت اعلیٰ مقام دیا گیا ہے۔ اس تعلق سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مشہور حدیث یہ ہے: اَلْجَنَّةُ تَحْتَ أَقْدَامِ الْأُمَّهَاتِ (مسند الشہاب القضاعی، حدیث نمبر 119)۔ یعنی، جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ یہ حدیث عام طور پر جس طرح سمجھی جاتی ہے وہ اس کے حقیقی مطلب کے بالکل برعکس ہے۔ اس حدیث کو اس طریقے سے لیا جاتا ہے جس میں ماں کو اعلیٰ مقام دیا گیا ہے۔ یعنی بچہ اگر جنت میں داخل ہونا چاہتا ہے تو وہ مکمل طور پر ماں کی فرمانبرداری کرے، اس کے بغیر بچہ کو جنت نہیں مل سکتی۔

مگر یہ اس حدیث کا درست مطلب نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ڈیوٹی کانشش سوسائٹی کی تعمیر کی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق، فرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے فرائض کو ادا کرے، وہ یہ نہ دیکھیں کہ دوسرے کیا کام کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو رسول اللہ نے دوسرے مقام پر اس طرح بیان کیا ہے: ایک مومن کو اپنی ذمہ داری ادا کرنا چاہیے اور جہاں تک اس کے حقوق کا تعلق ہے، وہ اس کو خدا سے مانگے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7052)۔ اس اصول کی بنیاد پر، "جنت ماں کے قدموں تلے واقع ہے" کا مطلب یہ ہوگا کہ بچے کے مقابلے میں ماں کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔ یہ حدیث اصل میں ایک ماں کو مخاطب کرتی ہے۔ کیوں کہ بچے کی زندگی میں اس کا بہت اہم رول ہے۔

دوسرے الفاظ میں اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسان کے اندر جنت کا شوق پیدا کرنا ماں کے ہاتھ میں ہے۔ مولانا وحید الدین خاں صاحب لکھتے ہیں کہ "ماں کی حیثیت سے اپنی اولاد کے لیے اس کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو ایک اچھا انسان بنانے کی کوشش کرے۔ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے ہر بچہ مسٹر نیچر ہوتا ہے، لیکن بعد کی کنڈیشننگ کے نتیجے میں ہر بچہ اپنی حقیقی فطرت سے دور چلا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ماں کو اپنا تعمیری رول ادا کرنا ہے" (الرسالہ، دسمبر 2007)۔

”کسی بچے کے تقریباً ابتدائی 10 سال وہ ہیں جن کو، نفسیاتی اصطلاح میں، تشکیلی دور (formative period) کہا جاتا ہے۔ یہ تشکیلی دور بے حد اہم ہے۔ کیوں کہ اِس تشکیلی دور میں کسی کے اندر جو شخصیت بنتی ہے، وہ بے حد اہم ہے۔ یہی شخصیت بعد کی پوری عمر میں باقی رہتی ہے۔“ (الرسالہ، مارچ 2019)

”ماں کی حیثیت سے عورت کا رول اگلی نسل کی تیاری ہے۔ انسان کی نسل ایک رواں دریا کی مانند ہے۔ انسانی سماج میں مسلسل ایسا ہوتا ہے کہ پچھلی نسل جاتی رہتی ہے اور نئی نسل اس کی جگہ لیتی رہتی ہے۔ ماں کا کام اِسی نئی نسل کی تیاری ہے۔ ماں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ہر بار اگلی نسل کے لیے بہتر انسان بنا کر بھیجے۔ بہتر انسان کون ہے۔ بہتر انسان وہ ہے جس کے اندر زندگی کا حوصلہ ہو۔ جو منفی سوچ سے بلند ہو اور مثبت سوچ کا حامل ہو۔ جو اپنے ذہن کے اعتبار سے اِس قابل ہو کہ وہ تعمیری بنیادوں پر زندگی کی منصوبہ بندی کر سکے۔ جو اپنے سماج کے لیے کوئی نیا پرابلم پیدا نہ کرے۔ جو اپنے سماج کا دینے والا ممبر (giver member) ہو، نہ کہ صرف لینے والا ممبر۔“ (الرسالہ، دسمبر 2007)

بچے مستقل طور پر اپنی ماں کے ساتھ رہتے ہیں۔ اپنی زندگی کے ابتدائی زمانے میں، وہ اس کو سب سے زیادہ دیکھ رہے ہوتے ہیں اور غیر شعوری طور پر اپنی ماں کی نقل کرتے ہیں۔ مگر ماں جو کام بھی کرتی ہے، وہ اس کا سوچا سمجھا عمل ہوتا ہے۔ اس لیے ماں کو اس بات کا بہت زیادہ خیال رکھنا چاہیے کہ وہ جو کام بھی کرے وہ خدا کی رضا کے مطابق کرے۔

جنت کی راہ ایک ایسی راہ ہے جو درست پلاننگ، تعلیم، تربیت، اور ناشکری کے بجائے شکر، بے صبری کے بجائے صبر اور خدا کی معرفت کی راہ ہے۔ اس بنا پر اس حدیث میں گویا ایک ماں کو یہ ذمہ داری دی گئی ہے کہ وہ اپنے بچے کو ایک اچھا انسان بنانے میں اپنا کردار ادا کرے۔ یہ حدیث ماؤں کے لیے ایک سنجیدہ پکار ہے کہ وہ اپنی اہمیت کو سمجھیں اور اپنے اندر اعلیٰ صفات پیدا کریں، کیوں کہ بچے اپنے تشکیلی دور میں سب سے زیادہ اپنی ماں کی پیروی کرتے ہیں۔ (ڈاکٹر فریدہ خانم)

کامیابی کا "پہلا قانون"

پرامید رہو، ناامید نہ بنو

برطانوی طبیعیات دان اور ریاضی دان سر آئزک نیوٹن (1642-1727ء) حرکت کے قوانین (Laws of Motion) کی دریافت کے لیے مشہور ہے۔ اس کے دریافت کردہ حرکت کا تیسرا قانون کہتا ہے کہ اس دنیا میں ہر عمل کے لیے ایک مساوی اور مخالف ردعمل ہوتا ہے:

for every action, there is an equal and opposite reaction.

لیکن ایک اور قانون بھی ہے جس کا مشاہدہ خود نیوٹن کی زندگی میں کیا جاسکتا ہے۔ اسے کامیابی کا قانون کہا جاسکتا ہے۔ نیوٹن کے والد کا انتقال ان کی پیدائش سے تین ماہ قبل ہوگیا تھا۔ اس کی ماں نے جلد ہی دوسری شادی کرلی۔ نتیجتاً نیوٹن اپنے والدین کی شفقت سے محروم ہوگیا۔ نیوٹن کے ایک سوانح نگار لکھتے ہیں— آئزک (نیوٹن) اپنے گھر میں ایک یتیم کی طرح سمجھا جاتا تھا، اس کا بچپن خوشگوار نہیں تھا:

Basically, treated as an orphan, Isaac (Newton) did not have a happy childhood.

نیوٹن کے لیے بظاہر یہ ایک مشکل صورتِ حال تھی۔ وہ چاہتا تو اپنے مائنڈ کو شکایتوں کا کباڑ خانہ بنا دیتا۔ لیکن حقیقت میں یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا پلس پوائنٹ بن گیا۔ بچپن کے دنوں میں خارجی دنیا نیوٹن کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتی تھی، اور وہ ہر وقت سوچ میں غرق رہتا تھا۔ اس بنا پر اسے خیالوں میں گم (Woolgatherer)، یا بے دھیان انسان کہا جانے لگا۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ نیوٹن بے دھیان انسان نہیں تھا، بلکہ وہ بہت زیادہ غور وفکر میں مشغول رہتا تھا۔ اسی مسلسل فکری عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے حرکت کے تین قوانین کو دریافت کیا، جس سے سائنسی دنیا میں انقلاب پیدا ہوگیا۔

نیوٹن کے لیے والدین کی شفقت سے محرومی بظاہر ایک منفی واقعہ تھا، لیکن قانونِ فطرت کے مطابق، یہ اس کے لیے فائدے کا سودا ثابت ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ والدین کی شفقت سے محرومی نے اسے اپنی پوشیدہ فکری صلاحیت کو پروان چڑھانے کا موقع دیا، یعنی فکری صلاحیت کی ترقی۔ اس

طرح نیوٹن اپنی فکری ترقی کے نتیجہ میں اس قابل ہو گیا کہ وہ اپنی زندگی کے مائنس پہلو کو پلس میں تبدیل کر سکے۔

کامیابی کا یہ فطری قانون کسی ایک فرد کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ یہ موقع زمین پر بسنے والے تمام عورت و مرد کے لیے کھلا ہوا ہے۔ نیوٹن کی زندگی فطرت کے اس اہم قانون کا عملی مظاہرہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اس کے خالق نے لامحدود پوٹنشل (potential) کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس پوٹنشل کو ایکچول (actual) بنانا صرف چیلنج کے حالات میں ممکن ہے۔ اگر چیلنج نہ ہو تو انسان کی شخصیت میں چھپے ہوئے امکانات ظہور میں نہیں آئیں گے، انسانی ارتقا کا عمل مکمل طور پر رک جائے گا، انسان اپنی تکمیل سے محروم رہ جائے گا۔

چیلنج سے کامیابی کی طرف اس کے سفر کو جمود یا مایوسی کے سوا کوئی اور چیز نہیں روک سکتی ہے۔ اگر وہ مایوس یا جمود کا شکار نہ ہو تو اس کی اپنی فطرت خود بخود اس کی رہنمائی کرے گی اور اسے ناقابل یقین حد تک ترقی کی منزل تک لے جائے گی۔ تاریخ میں ایسے لوگوں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جو اپنے ابتدائی عمر میں مختلف قسم کی پریشانیوں کا شکار ہو گئے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے آپ کو مایوسی سے دور رکھا، اور اپنی توانائی کو کسی بامعنی مقصد کی طرف موڑ دیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اعلیٰ کامیابی سے ہم کنار ہوئے جس کے بارے میں وہ اپنے ابتدائی دنوں میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کی ایک مثال انڈیا کے سابق صدر اے پی جے عبدالکلام (وفات 2015) ہیں۔

زندگی میں لوگوں کو اکثر ناخوشگوار حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر یتیمی، حادثات کا سامنا، مادی نقصان کو برداشت کرنا، تعلیم کا نامکمل رہنا، آبائی وراثت سے محروم ہونا، اچھی نوکری حاصل کرنے میں ناکامی، وغیرہ۔ لیکن وہ لوگ جو ان ناکامیوں کے باوجود کبھی ہمت نہیں ہارتے اور مثبت انداز میں مسلسل کوششیں جاری رکھتے ہیں، وہی آخر میں سپر کامیابی حاصل کرنے والے (super achiever) کے طور پر ابھرتے ہیں۔

ڈائری 1986

1 مئی 1986

آج مولانا شکیل احمد قاسمی (میرٹھ) سے ملاقات ہوئی۔ وہ میرٹھ کے ایک عربی مدرسہ میں صدر مدرس ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہاپوڑ میں شب برات (شعبان 1406ھ) کے دن جو فساد ہوا تھا وہ کس طرح ہوا تھا۔ اس کا قصہ یہ تھا کہ کچھ مسلمان سڑک پر آتش بازی کر رہے تھے۔ پڑوسی ہندو کے گھر میں چنگاریاں گئیں تو اس نے نکل کر مسلمانوں کو منع کیا۔ اس کے بعد مسلمان اور زیادہ زور کے ساتھ آتش بازی کرنے لگے۔ گویا وہ کوئی بہت بڑا اسلامی کام ہو۔ اب پڑوسی ہندو نے مزید شدت کے ساتھ منع کیا۔ مسلمانوں کو غصہ آ گیا اور ہندو کو مارنے لگے۔ اس کا لڑکا جس کا نام نریش تھا اس کو اتنا مارا کہ وہ زخمی ہو کر گر پڑا اور اسپتال جاتے جاتے مر گیا۔

اس کے بعد بستی میں فساد کی فضا پیدا ہو گئی۔ مگر حسن اتفاق سے مجسٹریٹ بہت اچھا تھا، اس نے سارے شہر میں پولس پھیلا دی اور نہایت سختی کے ساتھ فساد کو کنٹرول کر لیا۔ مولانا شکیل احمد صاحب قاسمی نے بتایا کہ فساد اگرچہ وقتی طور پر رک گیا ہے، مگر مقامی ہندوؤں میں غم و غصہ باقی ہے۔ بظاہر اس کا امکان نہیں ہے کہ وہ اس کو بھول جائیں گے۔ کیوں کہ ان کے ایک نوجوان نریش کو مسلمانوں نے مار مار کر ہلاک کر دیا ہے۔

میں نے کہا کہ بظاہر یہ کچھ مسلمانوں کی حماقت ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے براہِ راست ذمہ دار ہمارے قائدین ہیں۔ مسلم قائدین کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پر جوش تقریریں کر کے مستقل طور پر مسلمانوں کو جذباتی بنائے ہوئے ہیں۔ وہ ہر معاملہ میں یک طرفہ طور پر ہندوؤں کو اور حکومت کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل میں برادران وطن کے خلاف نفرت بھر گئی ہے۔ مزید یہ کہ جب اس طرح کے مسلمان بے جا طور پر مشتعل ہو کر مذکورہ قسم کی حرکتیں کرتے ہیں تو ہمارے قائدین کبھی ایسا نہیں کرتے کہ وہ مسلمانوں کو تنبیہ کریں۔ وہ ہمیشہ یک طرفہ طور پر ہندوؤں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ ان سب باتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ فساد کا سلسلہ کسی طرح ختم نہیں ہوتا۔

2 مئی 1986

آج اسلامک انسٹی ٹیوٹ، تغلق آباد میں ایک خصوصی تقریب تھی۔ یہ تقریب پاکستان کے سفیر ڈاکٹر ہمایوں خان کے اعزاز میں کی گئی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ کے خصوصی ہال میں لمبی میز کے کنارے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بڑی تعداد بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بھی اس میں شریک تھا۔

میں اس امید میں شریک ہوا تھا کہ کچھ علمی موضوعات یا اہم اسلامی مسائل پر گفتگو ہوگی اور مسلمانوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے خیالات سننے کا موقع ملے گا۔ مگر وہاں گفتگو زیادہ تر شاہ بانو بیگم اور مسلم پرسنل لا کے موضوع کے گرد گھومتی رہی۔

لوگوں نے مجھ سے کہا کہ آپ بھی اپنی رائے دیجئے۔ مگر میں خاموش صرف سنتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے لیے یہ بات زیادہ خوشی کی نہ تھی کہ مسلمانوں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کسی مقام پر اکٹھا ہو اور اس کے پاس گفتگو کے لیے جو موضوع ہو وہ شاہ بانو بیگم اور مطلقہ کو گزارہ دینے کا مسئلہ ہو۔

یہ علامتی طور پر پورے جدید دور میں مسلمانوں کی تصویر ہے۔ موجودہ دور مسلمانوں کے لیے نہایت فیصلہ کن دور تھا۔ مگر ہمارے قائدین نے جدید دور اور اس کے بنیادی مسائل کو نہ پہلے سمجھا اور نہ آج سمجھ رہے ہیں۔ سو برس سے ان کا یہی حال ہے کہ کوئی شوشہ کی چیز لے کر اس کو اچھالتے ہیں۔ اس پر دھواں دار تقریریں ہوتی ہیں اور جلسہ اور جلوس کے ہنگامے کیے جاتے ہیں۔ چونکہ عوام خواص کے طریقے پر ہوتے ہیں اس لیے وہ بھی وہی بولی بولتے ہیں جو ان کے خواص بول رہے ہوں۔

ہمارے قائدین اگر بنیادی مسائل کو چھیڑتے تو وہی تمام لوگوں کا موضوع گفتگو رہتے۔ مگر جب وہ "شاہ بانو بیگم" جیسے مسائل کو چھیڑیں گے تو وہی چیز عوام کا موضوع گفتگو بنے گی جس کو انہوں نے سب سے زیادہ چھیڑا ہے۔

3 مئی 1986

مجھے طبیہ کالج سہارن پور کا ایک خط (30 اپریل 1986) ملا۔ اس میں خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ میں ان کے سالانہ میگزین کے لیے ایک پیغام بھیجوں۔

عام طریقہ یہ ہے کہ اس قسم کا خط جب کسی کے پاس آتا ہے تو وہ قلم اور دوات سے ایک تحریر لکھ کر

روانہ کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پیغامات میں رسمی کلمات کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

مگر مجھے رسمی کلمات لکھ کر تسکین نہیں ہوتی۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی بات لکھوں جس کو ہندی میں تتو (core) کی بات کہتے ہیں۔ چنانچہ خط ملنے کے بعد میں نے انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا نکالی اور طبیہ کالج کی مناسبت سے اس میں history of medicine کا باب پڑھنا شروع کیا۔

اس کو پڑھتے ہوئے ایک بڑی کارآمد چیز مل گئی۔ مقالہ نگار نے لکھا تھا کہ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے طب اور سائنس میں جو غیر معمولی ترقی کی وہ بڑا تعجب خیز واقعہ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ساری دنیا میں علمی پسماندگی کا دور تھا۔ اس زمانہ میں علم الافلاک، علم نجوم کے ہم معنی بنا ہوا تھا، اور کیمسٹری کا علم محض کیمیا گری تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ معمولی دھات کو سونا کس طرح بنایا جائے۔ ایسے توہم پرستی کے دور میں مسلمانوں کی علمی ترقی بے حد حیرت انگیز ہے۔ (جلد 11، صفحہ 828)

انسائیکلو پیڈیا میں صرف اتنی سی بات درج تھی۔ میں نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ اس کی وجہ توحید کا عقیدہ تھا۔ توحید کا عقیدہ آدمی کو توہم پرستی سے نکالتا ہے۔ وہ آدمی کو ہر قسم کے مصنوعی بندھنوں سے آزاد ہو کر سوچنا سکھاتا ہے۔ وہ آدمی کو برتر حقیقت کی طرف بڑھنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے مسلمانوں کو مذکورہ کارنامے کے قابل بنایا۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں سے ایسے کارنامے ظاہر نہیں ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے لیے توحید محض ایک رسمی عقیدہ ہے، وہ ان کے لیے ذہنی انقلاب کے ہم معنیٰ نہیں۔

4 مئی 1986

آج انڈیا انٹرنیشنل سینٹر (نئی دہلی) میں ایک پروگرام تھا۔ یہ پروگرام انڈیا کے ایک معروف عالم دین کے حلقہ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ پروگرام کے ابتدا میں مذکورہ عالم دین کی تقریر ہوئی۔ اس کے بعد حاضرین کی طرف سے سوالات وجوابات ہوئے۔ حاضرین میں تقریباً نصف ہندو اور نصف مسلمان تھے۔ مجموعی طور پر 100 سے کم افراد تھے۔ تقریر اردو زبان میں تھی۔ البتہ اس کا انگریزی ترجمہ لوگوں کے درمیان تقسیم کیا گیا۔ انگریزی ترجمہ کا عنوان یہ تھا:

Try to understand the problems and sentiments of Indian Muslims.

تقریر تقریباً یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی مدافعت تھی۔ ان کی تقریر کا تاثر بظاہر یہ تھا کہ اس معاملہ میں ساری ذمہ داری ہندو فرقہ کی ہے۔

مقرر موصوف نے کہا کہ مسلمان اپنے پرسنل لا کا تحفظ چاہتے ہیں۔ یہ ایک فطری بات ہے، اور مسلمانوں کو اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے اس کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ مگر ملک کے پریس اور ملک کے دانشوروں نے جس ردعمل کا اظہار کیا ہے وہ بہت نامناسب ہے۔ اس معاملہ میں اتنا زیادہ شور کیا گیا ہے کہ گویا ملک پر ایٹم بم کا حملہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ زندگی میں احساس تناسب (sense of proportion) کی بے حد اہمیت ہے۔ اگر آپ شیر پر ایئر گن چلائیں اور ایک چھوٹی چڑیا کو رائفل سے ماریں تو یہ احساس تناسب کو کھو دینا ہوگا۔ یہی مسلمانوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔

مذکورہ عالم دین جب یہ بات کہہ رہے تھے تو میں نے سوچا کہ وہ خود کیا کر رہے ہیں۔ مسلم پرسنل لا کے عناصر میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے رات دن جو دھوم مچا رکھی ہے، کیا وہی دھوم وہ اسلام کے دوسرے معاملات کے لیے بھی مچا رہے ہیں۔ مثلاً ہندستان کے 80 کروڑ غیر مسلموں تک اسلام کو پہنچانے کے لیے کیا انہوں نے وہ جدوجہد کی ہے جو حقیقی تناسب کے اعتبار سے اس کے لیے کی جانی چاہیے۔

5 مئی 1986

میری ایک خاتون رشتہ دار کا واقعہ ہے۔ اس کی شادی ہلدوانی میں ہوئی ہے۔ شادی کے بعد وہ اپنے سسرال میں بہت خوش رہتی تھی۔ والدہ مرحومہ کی بیماری کے زمانے میں ایک مرتبہ ان کو دیکھنے کے لیے ہمارے یہاں آئی تو اس وقت وہ بہت تندرست تھی اور ہر وقت بس ہنسے جا رہی تھی۔

کل معلوم ہوا کہ اس کا دماغی توازن خراب ہو گیا ہے۔ اور وہ منٹل کیس کے طور پر آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ (ایمس) میں داخل ہے۔ چنانچہ میں اپنے گھر والوں کے ساتھ اس کو دیکھنے کے لیے آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ گیا۔ وہاں بڑے کمرہ میں مریضہ کے بہت سارے رشتہ دار جمع تھے، جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

اس وقت ایک بڑا عجیب واقعہ ہوا۔ مریضہ جو دیوانگی کی حالت میں تھی اور عجیب عجیب حرکتیں کرتی تھی، وہ ہر ایک کو اس کے نام کے ساتھ پکار رہی تھی۔ مگر میرے ساتھ اس نے بالکل مختلف معاملہ کیا۔ جب میں مریضہ کے سامنے آیا تو مریضہ کی ماں نے مریضہ کو میرے بارے میں بتایا۔ مگر مریضہ نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو اللہ والے ہیں۔ اس کے بعد وہ بار بار یہ جملہ دہراتی رہی: اللہ والے آئے ہیں، اللہ والے آئے ہیں۔

کچھ دیر کے بعد مریضہ نے کہا کہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں نے سلا کر اس کے پاؤں پر کمبل ڈال دیا۔ اس وقت بھی وہ کہتی رہی کہ اللہ والے آئے ہیں، اللہ والے آئے ہیں۔

میں ذاتی طور پر مبہوت کھڑا ہوا اس کو دیکھ رہا تھا۔ اور یہ سوچ رہا تھا کہ انسان بھی کس قدر عاجز ہے۔ ایک لمحہ میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ دولت، تندرستی، آل اولاد کسی چیز کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ تمام تر اللہ کے اختیار میں ہے کہ جس شخص کو چاہے جس حال میں رکھے۔ جب چاہے کسی کو دے اور جب چاہے کسی سے چھین لے۔

6 مئی 1986

4 مئی 1986 کو انڈیا انٹرنیشنل سینٹر (نئی دہلی) میں ڈائیلاگ (dialogue) کے نام سے ایک اجتماع تھا۔ یہ ڈائیلاگ سینٹر کے کانفرنس روم میں ہوا۔ ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ انڈیا کے ایک دینی قائد جو کہ معروف عالم دین بھی ہیں، ان کی تقریر سے اس کا آغاز ہوا۔ تقریر کرتے ہوئے انہوں نے پرجوش طور پر کہا کہ مسلمانوں سے وفاداری کا ثبوت مانگا جاتا ہے۔ یہ ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ ہم سے ہماری وفاداری کا ثبوت مانگے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں ہرگز ہندستان میں رہنے پر مجبور نہیں۔ مجھے کتنے ہی ملکوں کی یونیورسٹیوں سے آفر مل رہے ہیں اور میں باہر جا کر آرام کے ساتھ رہ سکتا ہوں۔

یہ بات بطور واقعہ صحیح ہو سکتی ہے کہ نہ صرف مذکورہ دینی قائد بلکہ ان کے جیسے دوسرے بہت سے قائدین کو باہر کے مسلم ملکوں کے مدارس اور جامعات سے آفر مل رہے ہوں۔ مگر یہ آفر کس چیز کا ہے۔ وہ یقینی طور پر "ملازمت" کا ہے، نہ کہ "قیادت" کا۔ مذکورہ دینی قائد اور ان کے جیسے دوسرے

قائدین مسلم ملکوں میں جا کر اپنے لیے روزگار ضرور حاصل کر سکتے ہیں، مگر وہ کسی بھی ملک میں اس طرح قائد بن کر نہیں رہ سکتے جیسے کہ وہ ہندستان میں بنے ہوئے ہیں۔

ہندستان میں مذکورہ عالم دین نے 1966 میں اپوزیشن کے ساتھ مل کر مخالف کانگریس (نان کانگریسزم) کی تحریک چلائی۔ 86-1985 میں وہ مسلم پرسنل لا کے نام پر حکومت کے خلاف جلسہ اور جلوس کی سیاست چلا رہے ہیں۔ اسی قسم کی سرگرمیوں کو میں قیادت کہہ رہا ہوں۔ اور کسی بھی مسلم ملک میں اس طرح کی قائدانہ سرگرمیاں قطعی ناممکن ہیں۔ مذکورہ دینی قائد اگر کسی مسلم ملک میں جا کر وہاں اس قسم کی سرگرمی دکھائیں تو یقینی طور پر وہاں سے نکال دیے جائیں گے۔ کسی بھی مسلم ملک میں قیام کی اجازت انہیں صرف اس قیمت پر ملے گی کہ وہ سیاست اور قیادت کی زندگی چھوڑ کر صرف ملازمت کی زندگی پر قانع ہو جائیں۔

یہاں میں اضافہ کروں گا کہ مذکورہ دینی قائد اور ان کے جیسے مسلم قائدین اگر ہندستان میں بھی قیادت کو چھوڑ کر صرف ملازمت پر قانع ہو جائیں تو یہاں بھی وہ اطمینان کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی شخص ان سے وفاداری کا مطالبہ کرنے والا نہیں۔

7 مئی 1986

ٹائمس آف انڈیا (3 مئی 1986) کے صفحہ اول پر ایک تصویر ہے۔ اس تصویر میں ایک شخص کو اس طرح دکھایا گیا ہے کہ وہ زمین پر سر رکھ کر سجدہ کر رہا ہے۔ تصویر دیکھ کر بظاہر وہ مسجد کا ایک واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ مسجد کا واقعہ نہیں۔ چنانچہ تصویر کے نیچے حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

The Punjab Chief Minister, Mr Surjit Singh Barnala, paying obeisance at the Golden Temple, on May 2,1986.

مسٹر سرجیت سنگھ برنالا، پنجاب کے چیف منسٹر ہیں۔ ان کی مرضی کے تحت سورن مندر (امرتسر) میں 30 اپریل کو پولس ایکشن ہوا۔ پولس ایکشن کی تکمیل کے بعد وہ سُوَرن مندر (گولڈن ٹمپل) گئے جو سکھوں کے نزدیک ان کا سب سے زیادہ متبرک مقام ہے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے اظہار عقیدت کے طور پر اپنا سر زمین پر رکھ دیا۔ اس وقت ان کی

ہیئت ٹھیک وہی تھی جو نماز میں سجدہ کرنے والے کی ہوتی ہے۔

نماز میں سجدہ کا جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ بڑا عجیب ہے۔حقیقت یہ ہے کہ عبودیت یا submission کے اظہار کے لیے یہ آخری طریقہ ہے۔اس سے آگے کوئی طریقہ ممکن نہیں ہے۔

submission کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔انسان عین اپنی فطرت کے زور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ کسی کے آگے اپنے کو جھکا دے۔خدا کے سوا دوسری جن چیزوں کے آگے آدمی ”سجدہ“ کرے وہ حقیقتاً اپنے جذبۂ عبودیت کا غلط استعمال کر رہا ہے۔آدمی جب خدا کو پائے ہوئے نہ ہو تو وہ جس چیز کو بھی بظاہر نمایاں دیکھتا ہے اس کے آگے اپنے کو جھکا دیتا ہے۔اسی کا نام شرک ہے۔یعنی جو چیز صرف ایک خدا کا حق ہے، اس میں دوسروں کو شریک کرنا۔اور شرک بلاشبہ سب سے بڑا گناہ ہے۔انسان ”سجدہ“ کرنے پر مجبور ہے، مگر سچا سجدہ وہی ہے جو خدا کے لیے کیا گیا ہو۔

8 مئی 1986

دو صاحبان تشریف لائے۔وہ ہریانہ کے رہنے والے تھے۔وہ چاہتے تھے کہ مجھے اپنے یہاں تقریر کرانے کے لیے لے جائیں۔انہوں نے کہا کہ ہم الرسالہ پڑھتے رہے ہیں۔ہم کو الرسالہ کے طرز فکر سے اتفاق ہے۔اس انداز پر ہم وہاں ایک اسلامی ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔جس میں مسجد اور مدرسہ، مسافر خانہ اور مختلف قسم کے ہنر سکھانے کا شعبہ ہوگا۔مقامی طور پر کچھ لوگ اپنی ذاتی لیڈری کے لیے ہماری مخالفت کر رہے ہیں۔اگر آپ ایک دن اور ایک رات کے لیے ہمارے یہاں آجائیں گے تو یہ مخالفین دب جائیں گے۔

اس علاقہ میں الرسالہ ابھی نہیں پھیلا ہے۔میں نے ان حضرات سے کہا کہ اگر آپ مجھ کو وہاں لے جانا چاہتے ہیں تو پہلے آپ الرسالہ کو اپنے علاقہ میں پھیلائیے۔آپ الرسالہ کی ایجنسی لیجیے۔جب وہاں الرسالہ کے پڑھنے والے قابل لحاظ تعداد میں پیدا ہو جائیں گے اس وقت وہ فضا بنے گی جس میں میرا وہاں جانا مفید ہوگا۔فضا بننے سے پہلے اگر میں وہاں جاؤں تو لوگ میری بات کو سمجھ نہیں سکیں گے اور سفر کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

وہ لوگ مجھ کو اپنے علاقہ میں لے جانے پر کافی اصرار کر رہے تھے، مگر جب میں نے الرسالہ

کی ایجنسی قائم کرنے کی بات کی تو ان کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کے بعد وہ دونوں خاموشی کے ساتھ اٹھ کر چلے گئے۔

یہی ہماری قوم کی عام حالت ہے۔ لوگ تعمیری کام کی بات کرتے ہیں، مگر وہ تعمیری کام کی قیمت دینے کے لیے تیار نہیں۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں کا ذہن بگڑا ہوا ہے۔ لیڈروں نے اپنی جھوٹی سیاست سے پوری قوم کو منفی سوچ میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ایسی حالت میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ذہنوں کی اصلاح کی جائے۔ لوگوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنے والا بنایا جائے۔ اس کے بعد ہی کوئی حقیقی تعمیری کام کیا جا سکتا ہے۔ مگر ذہن بنانے کا کام خشک کام ہے، اس لیے کوئی اس کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

9 مئی 1986

ایک پاکستانی مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا پاکستان میں ہندوؤں کا کیا حال ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں اولاً تو ہندو بہت ہی کم ہیں۔ ان کی زیادہ تعداد 1947 کے انقلاب میں پاکستان کو چھوڑ کر ہندستان چلی آئی۔ اور جو تھوڑے سے ہندو وہاں رہ گئے ہیں، وہ تہذیبی اعتبار سے بالکل مسلمانوں کی طرح رہتے ہیں۔ کسی بھی اعتبار سے وہ اپنا تشخص باقی رکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

میں نے کہا کہ یہ ایک بہت اہم بات ہے۔ اس سے مسلمانوں کو سبق لینا چاہیے۔ پاکستان کی تحریک مسلمانوں نے یہ کہہ کر چلائی تھی کہ غیر منقسم ہندستان کو دو جغرافی حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ ایک ہندو انڈیا اور دوسرا مسلم انڈیا۔ ایک طرف وہ ہو جائیں اور دوسری طرف ہم ہو جائیں۔ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نے اس نعرہ کا ساتھ دیا اور ہندستان بھارت اور پاکستان کی شکل میں الگ الگ ہو گیا۔

پاکستان کو ہندوؤں سے تقریباً خالی کرا لیا گیا۔ وہاں ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ ہندو اپنے الگ قومی تشخص کے ساتھ وہاں نہ رہ سکیں۔ وہ رہیں تو صرف اس قیمت پر رہیں کہ وہ مسلم تہذیب میں بالکل ضم ہو جائیں۔ موجودہ پاکستان اس کا ایک نمونہ ہے۔ اس کے برعکس، ہندستان میں باوجود یہ کہ

وہ پاکستانی منطق کے مطابق ہندوانڈیا تھا، مسلمان تقریباً 10 کروڑ کی تعداد میں باقی رہے۔ یعنی اس سے بھی زیادہ جتنا کہ وہ موجودہ پاکستان میں ہیں۔ مزید یہ کہ انہوں نے یہاں پورے معنوں میں اپنا قومی تشخص باقی رکھا ہے۔

اس کے باوجود ہندستان کے ہندو مسلمانوں کو برداشت کررہے ہیں۔ ہندستان میں جو نام نہاد فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں وہ تمام تر مسلمانوں کی حماقت یا شرارت سے ہوتے ہیں۔ اگر ہندو اسی انتہاپسندانہ ذہن کا ثبوت دیتا جس کا ثبوت پاکستان کے مسلمانوں نے دیا ہے تو آج ہندستان میں مسلمانوں کی تاریخ دوسری نظر آتی۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص انسان کا شکر نہ کرے وہ خدا کا بھی شکر نہیں کرسکتا (مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ، لَمْ يَشْكُرِ اللهَ عزوجل) مسند احمد، حدیث نمبر 7504۔ اس حدیث کے مطابق مسلمانوں کو ہندوؤں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اگر وہ ہندو کے شکر گزار نہ بنیں گے تو وہ خدا کے شکر گزار بھی نہیں بن سکتے۔

10 مئی 1986

مئی 1986 میں مسلم خواتین کے طلاق سے متعلق قانون لوک سبھا اور راجیہ سبھا سے پاس ہو کر باقاعدہ ایکٹ بن گیا۔ اس کا سرکاری نام یہ ہے:

Muslims Women (Protection of Right on Divorce) Bill 1986.

اس بل پر مسلم قائدین آج کل خوشیاں منا رہے ہیں۔ اس کو وہ سیکولر ہندستان میں اسلام کی عظیم فتح سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ جھوٹی فتح پر جھوٹی خوشی منانا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس میں مسلمان پچھلے سو سال سے مبتلا ہیں۔

ایک لطیفہ ہے کہ ایک علاقہ میں ایک شیر گھس آیا۔ اس نے جانوروں اور انسانوں کو پھاڑنا شروع کر دیا۔ سارے علاقے میں زبردست خوف وہراس پھیل گیا۔ اس وقت ایک بزرگ نے یہ کیا کہ اپنے گھر میں کاغذ کا ایک شیر بنایا۔ اور پھر اس کاغذی شیر پر حملہ کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔ بزرگ نے یہ سمجھا کہ انہوں نے شیر پر فتح حاصل کر لی ہے۔ حالانکہ انہوں نے جس

چیز پر فتح حاصل کی تھی وہ محض ایک کاغذ کی تصویر تھی، نہ کہ حقیقتاً ایک زندہ شیر۔

یہی ماحول موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ہوا ہے۔ وہ ایک کے بعد ایک کاغذی شیر بناتے ہیں اور اس کو ہلاک کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اسلام مخالف طاقتوں پر فتح حاصل کر لی۔ مگر اسلام مخالف طاقتیں بدستور موجود رہتی ہیں بلکہ ان میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔

جو شخص بھی حالات پر گہری نظر رکھتا ہو اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ مذکورہ مسلم خواتین بل کا کچھ بھی تعلق اصل حالات کی اصلاح سے نہیں ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مطلقہ مسلم خواتین کا مسئلہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے، نہ کہ کوئی قانونی مسئلہ۔ اس قسم کے قوانین سے یہ امید رکھنا کہ اصل مسئلہ اس سے حل ہو جائے گا ایسا ہی ہے جیسے کاغذی شیر کو مار کر یہ سمجھنا کہ زندہ شیر بھی ہلاک ہو گیا ہے۔

ہمارے قائدین کو اگر ملت کا درد ہے تو ان کو معاشرے کی اصلاح میں لگ جانا چاہیے۔ مذکورہ بالا قسم کا عمل، قرآن کے الفاظ میں، صرف يُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا (3:188) کا مصداق ہے۔ یعنی، وہ چاہتے ہیں کہ جو کام انھوں نے نہیں کیے اس پر ان کی تعریف ہو۔

12 مئی 1986

آج ایک مجلس میں موت کا ذکر آیا۔ میں نے کہا کہ موت اس دنیا میں سب سے زیادہ یقینی چیز ہے۔ وہ ہر آدمی کے اوپر اپنے وقت پر آ جاتی ہے۔ مجلس کے ایک صاحب نے کسی قدر بے تکلف انداز میں کہا کہ موت کو کون نہیں جانتا۔ یہ تو ایسی چیز ہے جس سے ہر شخص باخبر ہے۔

میں نے کہا کہ لوگ عام طور پر موت کو صرف مانتے ہیں کہ انہوں نے اس کو سنا ہے۔ موت ان کے لیے ایک سنی ہوئی بات ہے۔ مگر میں اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ موت میری دریافت ہے۔ میں موت کو اس لیے مانتا ہوں کہ میں نے خود اس کو شعوری سطح پر دریافت کیا ہے۔

اس کے بعد میں نے اپنا ایک واقعہ بتایا۔ غالباً 1960 کی بات ہے۔ اس وقت میں اپنے آبائی وطن (بڈھریا) میں تھا۔ میں مکان کی چھت پر سو رہا تھا۔ اور گھر کے بقیہ لوگ نیچے سوئے تھے۔ تقریباً نصف شب میں میری نیند کھلی اور اچانک مجھے اپنا ایک معاملہ یاد آیا۔

ایک صاحب نے مجھے 100 روپے بطور امانت دیا تھا۔ یہ سو روپے کا ایک نوٹ تھا۔ اس

کو میں نے نیچے کے ایک کمرے کی الماری میں کاغذ کے نیچے رکھ دیا تھا۔ رات کو مجھے یہ خیال آیا کہ اگر اچانک مجھے موت آجائے تو اس رقم کا کیا ہوگا۔ کیونکہ گھر کا کوئی شخص اس کے بارے میں واقف نہ تھا۔ چنانچہ میں بستر سے اٹھا۔ لالٹین جلائی اور ایک کاغذ پر یہ لکھا کہ میرے پاس فلاں شخص کا سو روپیہ بطور امانت ہے اور وہ فلاں الماری میں کاغذ کے نیچے رکھا ہوا ہے۔ اس طرح کا کاغذ لکھ کر میں نے اس کو اپنی جیب میں رکھا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

اس وقت میرے ذہن پر موت کا اتنا غلبہ تھا کہ اگر میں مذکورہ قسم کا کاغذ لکھ کر اپنی جیب میں نہ رکھتا تو شاید مجھے دوبارہ نیند نہ آتی۔ مگر جب میں نے یہ کاغذ اپنی جیب میں رکھ لیا تو اس کے جلد ہی بعد دوبارہ مجھے نیند آ گئی۔ اگرچہ صبح کو جب میں سو کر اٹھا تو میں ابھی زندہ تھا۔ موت ہر آدمی پر لازماً آتی ہے، مگر وہ ہمیشہ اپنے وقت پر آتی ہے۔ نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔

13 مئی 1986

محمد رضا صاحب عجیب وغریب آدمی ہیں۔ وہ اپنے آفس میں لڑتے رہتے ہیں۔ کسی کی بات نہیں سنتے۔ مگر میری بات سن لیتے ہیں۔ اگرچہ مجھے اس کی وجہ نہیں معلوم۔

ان کو اپنے دفتر سے کچھ رقم ملی تھی۔ ان کی اہلیہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ وہ اپنے مزاج کی وجہ سے رقم ضائع کر دیں گے۔ چنانچہ ان کی اہلیہ کا پیغام میرے پاس آیا کہ وہ آپ کی بات سنتے ہیں۔ آپ ان سے رقم لے کر اپنے پاس رکھ لیں اور بوقت ضرورت دیتے رہیں۔ چنانچہ میں نے یہ رقم (دس ہزار) ان سے لے کر بطور امانت اپنے پاس رکھ لی۔ وہ اکثر آتے ہیں اور حسب ضرورت رقم لے جاتے ہیں۔

آج ہمارے دفتر والوں نے انٹر کام پر بتایا کہ رضا صاحب آئے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ ان سے پوچھو کہ انہیں کتنی رقم چاہیے۔ رضا صاحب نے کہا کہ اس وقت میں رقم کے لیے نہیں آیا ہوں۔ صرف ملاقات کرنا ہے۔ چونکہ رضا صاحب اپنے غیر معتدل ذہن کی وجہ سے اکثر غیر متعلق اور طویل باتیں کرتے ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ اگر رقم کی ضرورت ہو تو لے لیں مگر اس وقت ملاقات کا موقع نہیں ہے۔

رضا صاحب واپس چلے گئے۔ مگر اس کے چند منٹ بعد مجھے احساس ہوا کہ میں نے انہیں اس

طرح لوٹا کر سخت غلطی کی ہے۔ غلطی کا احساس ایک بھاری بوجھ کی طرح دل کے اوپر محسوس ہونے لگا۔ فوراً ہی مجھے ایک حدیث یاد آئی اور میں دل ہی دل میں رضا صاحب کے لیے دعا کرنے لگا، دعا کے الفاظ یہ تھے — خدایا رضا صاحب کی مدد فرما۔ خدایا رضا صاحب کے احوال درست کردے۔

اس قسم کی دعائیں میں دل ہی دل میں تقریباً آدھے گھنٹے تک کرتا رہا۔ اس کے بعد اچانک ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میرے دل کا بوجھ اتر گیا ہے۔ جو دل پہلے سخت بوجھل محسوس ہو رہا تھا وہ اچانک بالکل ہلکا ہو گیا۔

شاید یہی مطلب ہے اس آیت کا جس میں ارشاد ہوا ہے: إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (11:114)۔ یعنی بیشک نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو۔

آدمی سے اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اس کو چاہیے کہ غلطی کی مناسبت سے کوئی نیک عمل کرے۔ یہ نیک عمل اس کی غلطی کو ان شاء اللہ زائل کردے گا۔

14 مئی 1986

یمین الاسلام خان میرے بھتیجے ہیں۔ وہ انجینئر ہیں اور لکھنؤ میں آبپاشی کے محکمہ میں سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ آج وہ دہلی آئے۔ بات چیت کے دوران انہوں نے ایک سبق آموز مقولہ بتایا:

جب آپ ہنستے ہیں تو دنیا آپ کے ساتھ ہنستی ہے۔ مگر جب آپ روتے ہیں تو دنیا آپ کے اوپر ہنستی ہے۔

یہ ایک بہت بامعنی مقولہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دنیا میں ایک آدمی دوسرے آدمی سے بننے کی حد تک دلچسپی رکھتا ہے۔ کسی کی بگڑ رہی ہو تو اس سے دوسروں کو کوئی دلچسپی نہیں۔

بہت سے لوگوں کا یہ مزاج ہے کہ جب وہ کسی سے ملتے ہیں تو اس کو اپنا غم سنانے لگتے ہیں۔ مگر اس سے زیادہ حماقت اور کچھ نہیں۔ اس دنیا میں ہر آدمی اپنے مسائل سے دوچار ہے۔ کسی کو یہ موقع نہیں کہ وہ دوسرے کے مسائل میں دلچسپی لے۔ وہ دوسرے کے درد میں اس کا حصہ دار بن سکے۔

حقیقت پسندی کی بات یہ ہے کہ اس دنیا میں آدمی پر جو کچھ بیتے وہ خود اس کو سہے۔ وہ خود اپنے مسائل کو حل کرنے کی تدبیر کرے۔

یہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں ہر آدمی کو اپنی لڑائی خود لڑنی پڑتی ہے۔ یہاں کوئی شخص دوسرے کے لیے نہیں لڑتا۔ ہر آدمی اپنی ناکامی کا خود ذمہ دار ہے۔ ایک شخص نہ دوسرے شخص کی کامیابی میں شریک ہوسکتا ہے اور نہ اس کی ناکامی میں۔

15 مئی 1986

موجودہ زمانے میں بہت سی نیوز ایجنسیاں ہیں۔ ان میں مشہور نیوز ایجنسیاں حسب ذیل ہیں: اسوسی ایٹڈ پریس (AP)، یونائیٹڈ پریس انٹرنیشنل (UPI)، رائٹر، فرنچ پریس ایجنسی (AFP)۔

اے ایف پی کے بارہ ہزار خریدار (سبسکرائبرز) ہیں۔ جو 150 سے زیادہ ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اخباروں کے علاوہ ریڈیو، ٹیلی ویژن، بینکوں، انٹرنیشنل تنظیموں کو خبریں سپلائی کرتی ہیں۔ یہ نیوز ایجنسی ہر روز چھ مختلف زبانوں (فرانسیسی، انگریزی، جرمن، اسپینی، پرتگالی، عربی) میں ایک ملین الفاظ بھیجتی ہے جن کو ایک ہزار ملین افراد پڑھتے ہیں۔

اس نیوز ایجنسی کو یہ کامیابی ڈیڑھ سو سال میں حاصل ہوئی ہے۔ ابتداءً اس کو چارلس ہواس (Charles-Louis Havas, 1783-1858) نے 1835 میں قائم کیا۔ اس وقت کبوتروں (carrier pigeon) کے ذریعے دور کے مقامات تک خبریں بھیجی جاتی تھیں۔ اس کے بعد ٹیلی گراف کا زمانہ آیا۔ پھر وائرلیس کا۔ پھر ریڈیو کا اور اب وہ سیٹلائٹ کے ذریعہ خبریں پہنچانے کے دور میں داخل ہوگئی ہے۔ اے ایف پی پہلے الفاظ کی ترسیل کا نام تھی۔ اب وہ سیٹلائٹ کے ذریعے فوٹو کی ترسیل کا کام بھی کر رہی ہے۔ اس وقت اس کے تین فوٹو گرافک سینٹر ہیں، پیرس، واشنگٹن اور ٹوکیو (ٹائمس آف انڈیا، 15 مئی 1986)۔

مسلمان ان مغربی نیوز ایجنسیوں کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ خبروں کو مغربی نقطۂ نظر سے پیش کرتی ہیں اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو نظر انداز کرتی ہیں۔ مگر یہ سراسر لغو شکایت ہے۔ اس دنیا

میں کوئی شخص دوسرے کا کام نہیں کرتا۔ مسلمان اگر یہ چاہتے ہیں کہ ان کی خبریں ان کے نقطۂ نظر کے مطابق دنیا میں پھیلیں تو وہ بھی "ڈیڑھ سو سالہ" عمل کے نتیجے میں ایک اعلیٰ سطح کی نیوز ایجنسی عمل میں لائیں۔ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔

16 مئی 1986

نظام الدین (دہلی) میں ہمارے مرکز کے سامنے سڑک کے دوسری طرف ایک سردار جی کا دومنزلہ مکان ہے۔ اس مکان میں بہت سے عرب طلبا کرایہ دار کے طور پر رہتے ہیں۔ آج ایک بجے دن میں، میں جمعہ کی نماز کے لیے مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ راستہ میں ان میں سے تین عرب طلبا ملے۔ انہوں نے مجھے سلام کیا۔ میں نے بھی ان کو سلام کا جواب دیا۔ اس کے بعد میں نے پوچھا: من ای بلد انتم (آپ کا تعلق کس ملک سے ہے)۔ ان میں سے ایک نوجوان خاص لہجہ میں بولا: من بلاد اللّٰہ فلسطین (اللہ کے ملک فلسطین سے)۔ اس نے یہ جملہ کہا اور پھر فوراً اپنے ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

ان فلسطینی طلبا سے میری ملاقات بہت کم ہو سکی ہے۔ مگر چونکہ وہ بالکل سامنے والے مکان میں قیام پذیر ہیں، اس لیے میں ان کو پچھلے ایک سال سے زیادہ عرصہ سے دیکھ رہا ہوں۔ سب سے زیادہ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ اگرچہ یہاں تعلیم کی غرض سے آئے ہیں، مگر بہت کم ایسا ہوا ہے کہ وہ پڑھتے ہوئے دکھائی دیں۔ ممکن ہے وہ اپنے بند کمروں میں پڑھتے ہوں، مگر اپنی چھت پر اور اپنے صحن میں وہ ہمیشہ تفریح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور تفریح کا یہ سلسلہ منٹوں نہیں بلکہ گھنٹوں جاری رہتا ہے۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ وہ ایک سپیرے کو پکڑ لائے اور تقریباً آدھے دن تک سب جمع ہو کر سانپ کا کھیل دیکھتے رہے اور اس کے ساتھ تصویریں کھینچواتے رہے۔ اکثر ان کے کمرے سے ٹیپ ریکارڈر بجنے کی آواز آتی ہے جو بہت دیر تک جاری رہتی ہے۔ کبھی ایئر گن لے کر سارا دن چڑیوں پر نشانہ لگاتے رہتے تھے، وغیرہ۔

مجھے اپنے باہر کے سفروں میں بعض ایسے فلسطینی ملے ہیں جو نہایت سنجیدہ تھے، مگر غالباً بیشتر فلسطینیوں کا مزاج وہی ہے، جس کا نقشہ اوپر کی مثال میں نظر آتا ہے۔ جو لوگ اس قدر غیر سنجیدہ ہوں، جو اتنی بے دردی کے ساتھ اپنے وقت کو برباد کریں وہ موجودہ مقابلہ کی دنیا میں کس طرح کامیاب ہو سکتے ہیں۔

17 مئی 1986

نئی دہلی کے ایک ہال میں مسلمانوں نے ایک جلسہ کیا۔ اس میں مسلمانوں کے ایک مشہور قائد نے تقریر کی۔ جلسہ میں ہندو صحافی اور دانشور بھی بلائے گئے تھے۔ تقریر کا خاص موضوع اسلامی شریعت تھا۔ ہال میں شاہ بانو کے معاملہ پر مسلمانوں نے جو زور و شور دکھایا ہے، اس کی وجہ سے غیر مسلموں میں شریعت کے بارے میں عمومی طور پر ایک تجسس پیدا ہو گیا ہے۔ یہ جلسہ 4 مئی 1986 کو ہوا۔ خصوصی مقرر نے پر جوش تقریر کی۔ مگر تقریر میں زیادہ تر اس قسم کی باتیں تھیں کہ شریعت ہم کو جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ ہم کسی قیمت پر شریعت کے اندر مداخلت کو برداشت نہیں کر سکتے، وغیرہ۔

ایک ہندو نے تقریر کے بعد کہا کہ موجودہ دور میں اس قسم کی باتیں قبول نہیں کی جا سکتیں۔ اگر آپ یہ کہیں کہ ہماری شریعت میں لکھا ہے کہ بہو کو تیل چھڑک کر جلا دو تو کیا آپ اپنی بہو کو جلا دیں گے اور ملک خاموش رہے گا۔ آپ کو اپنے قانون کی معقولیت بتانی ہوگی۔ صرف دعویٰ کافی نہیں ہو سکتا۔

یہی موجودہ زمانہ میں ہمارے تمام لکھنے اور بولنے والوں کا حال ہے۔ "مداخلت فی الدین" کے نام پر وہ زبردست جوش دکھائیں گے، مگر دین کی معقولیت ثابت کرنے کے لیے محنت نہیں کریں گے۔ حالانکہ زمانہ عقل کا زمانہ ہے۔ آج کا آدمی عقل کی سطح پر ہر چیز کو جانچتا ہے۔ دین کو عصری اسلوب میں پیش کرنے کا حکم ہے، مگر مسلمان اس کو صرف اسلوبِ ماضی میں پیش کر رہے ہیں۔

انہیں تجربات سے متاثر ہو کر میں آج کل ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں جس کا نام ہے "خاتونِ اسلام"۔ میرا یہ موضوع نہیں۔ میرا اصل موضوع دعوت ہے۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ انہوں نے شاہ بانو کے مسئلہ کو لے کر شریعت کا ہنگامہ کھڑا کر دیا، مگر شریعت کو زمانہ کے اسلوب میں پیش کرنے کے لیے وہ کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ اس لیے مجھ کو یہ ذمہ داری قبول کرنی پڑی۔

18 مئی 1986

مسٹر سرجیت سنگھ برنالا اس وقت پنجاب کے چیف منسٹر ہیں۔ ان کے حکم سے 30 اپریل 1986 کو مسلح پولس امرتسر کے گوردوارہ (سورن مندر) میں داخل ہو گئی۔ تاکہ وہاں سے دہشت پسندوں کو نکالے۔

یہ واقعہ سکھ روایات کے مطابق جرم تھا۔ اس سے گوردوارہ کا تقدس مجروح ہوا۔ چنانچہ اکالی تخت نے مسٹر برنالا کے نام نوٹس جاری کیا۔ وہ نوٹس کے مطابق 17 مئی 1986 کو اکالی تخت کے سامنے حاضر ہوئے۔ مسٹر برنالا نے اکالی تخت کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کیا۔ اس کے بعد اکالی تخت کی طرف سے ان کے لیے سزا کا اعلان کیا گیا۔ اس سزا کی پانچ دفعات تھیں۔ انگریزی اخبار کی رپورٹنگ کے مطابق اس کی ایک دفعہ یہ تھی:

To perform the service of dusting the shoes at any gurudwara for one week.

وہ ایک ہفتہ تک کسی گوردوارہ میں جوتا صاف کرنے کی خدمت انجام دیں (ٹائمس آف انڈیا، 18 مئی 1986)۔ مسٹر برنالا نے سر جھکا کر اعلان کیا کہ وہ اکالی تخت کے فیصلہ کو قبول کرتے ہیں۔

سکھ حضرات نے آج کل آزاد سکھستان بنانے کے لیے توڑ پھوڑ کی جو سیاست چلا رکھی ہے اس سے مجھے صد فی صد اختلاف ہے۔ میں اس کو صرف حماقت سمجھتا ہوں۔ مگر مذکورہ واقعہ بتاتا ہے کہ سکھ حضرات کی مذہبی تنظیم کتنی مضبوط ہے۔ یہی طاقت ایران میں شیعہ پیشواؤں کو حاصل تھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ ایران میں بھی ایسی طاقت کا استعمال تخریب کے لیے کیا گیا اور پنجاب میں بھی اس کا استعمال صرف تخریب کے لیے ہو رہا ہے۔

19 مئی 1986

”ہر آدمی جھوٹے اسلام میں آگے ہے، مگر وہ سچے اسلام سے دور ہے“ — بے اختیار میری زبان سے نکلا۔ آج کل کے مسلمانوں کو میں دیکھتا ہوں تو تمام مسلمان، خواہ وہ اصاغر ہوں یا اکابر، مجھے اسی ایک سطح پر نظر آتے ہیں۔ ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ اسلام پر پُر جوش تقریریں کر رہا ہے۔ ہر آدمی اسلام پر مضامین لکھ کر چھاپ رہا ہے۔ ہر آدمی اسلام کا جھنڈا اٹھائے ہوئے کھڑا ہے۔ مگر جب عملی تجربہ کیجیے تو ہر مسلمان ایسا نظر آئے گا جیسے وہ اسلام سے بالکل خالی ہو۔

آج کل کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتے۔ مگر دوسروں

کے خلاف ہر آدمی تقریر وتحریر کا مجاہد بنا ہوا ہے۔ اپنی ذات کے معاملہ میں اس کے سوچنے کا انداز دوسرا ہے اور دوسروں کے بارے میں اس کے سوچنے کا انداز دوسرا۔ کسی کو ایک امانت سونپ کر آپ یہ امید نہیں کر سکتے کہ وہ اس امانت میں خیانت نہیں کرے گا۔ کسی شخص کو آپ ایک سچی نصیحت کریں تو آپ کی یہ امید کبھی پوری نہ ہوگی کہ وہ نصیحت کو مانے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھا لے۔ ایک شخص کے اندر انانیت جاگ اٹھے تو ناممکن ہے کہ قرآن وحدیث کا کوئی بھی حوالہ اس کو دوبارہ اپنے غلط موقف سے دور کر سکے۔

آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ خواہ کتنی ہی کھلی ہوئی غلطی کرے وہ کبھی اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرے گا۔ وہ ایک بار بے انصافی کی طرف قدم اٹھا دے تو اس کو کسی بھی طرح انصاف کی طرف واپس لانا ممکن نہیں ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمان فکری زوال کے اعتبار سے آخری حد تک پہنچ چکے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کا حال دیکھ کر کبھی کبھی مجھے اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ وہ، بائبل کے الفاظ میں، "مردود چاندی (rejected silver)" تو نہیں ہو گئے ہیں، جس طرح ان سے پہلے کی اہل کتاب قومیں اپنے زوال کے زمانے میں ہو گئی تھیں، جب کہ خدا نے ان کو ریجکٹ کر دیا تھا۔ جیسا کہ بائبل میں بیان کیا گیا ہے:

> وہ سب کے سب نہایت سرکش ہیں۔ وہ غیبت کرتے ہیں۔ وہ تانبا اور لوہا ہیں۔ وہ سب کے سب مُعاملہ کے کھوٹے ہیں۔ دھونکنی جل گئی۔ سیسا آگ سے بھسم ہو گیا۔ صاف کرنے والے نے بے فائدہ صاف کیا۔ کیوں کہ شریر الگ نہیں ہوئے۔ وہ "مردود چاندی" کہلائیں گے۔ کیوں کہ خداوند نے اُن کو رد کر دیا ہے۔ (یرمیاہ، 6:28-30)
>
> They are all hardened rebels, going about to slander. They are bronze and iron; they all act corruptly. The bellows blow fiercely to burn away the lead with fire, but the refining goes on in vain; the wicked are not purged out. They are called REJECTED SILVER, because the Lord has rejected them. (Jeremiah 6:28-30)

عیب خوانی، قصیدہ خوانی

مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگ موجودہ زمانے میں صرف دو کلچر کو جانتے ہیں، عیب خوانی یا قصیدہ خوانی۔ اپنے مفروضہ اکابر کے بارے میں صرف قصیدہ خوانی، اور دوسروں کے بارے میں صرف عیب خوانی۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں میں یہ کلچر اتنا عام ہے کہ شاید ہی اس میں کوئی استثنا پایا جائے۔ اپنے حلقے کی زندہ یا مردہ شخصیتوں کی لفظی قصیدہ خوانی، اور اپنے حلقے سے باہر کے لوگوں کی لفظی عیب خوانی۔ نہ ان کی قصیدہ خوانی دلائل پر مبنی ہوتی ہے، اور نہ ان کی عیب خوانی دلائل کی زبان میں ہوتی ہے۔ وہ اپنوں کے بارے میں صرف تعریف کی زبان جانتے ہیں، اور دوسروں کے بارے میں صرف تنقیص کی زبان۔

یہ امت کے دورِ زوال کا ظاہرہ ہے۔ امت جب اپنے زمانۂ عروج میں ہو تو وہ ہر شخص کو میرٹ (merit) کے اعتبار سے جانچتی ہے۔ وہ ہر ایک کے بارے میں میرٹ کی بنیاد پر غیر متعصّبانہ رائے قائم کرتی ہے۔ خواہ وہ اپنا ہو یا اپنے دائرے سے باہر کوئی شخص۔ مگر جب امت دورِ زوال میں پہنچ جائے تو اس وقت اس کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ وہ انسانوں کو اپنے اور غیر میں تقسیم کر دیتی ہے۔ اپنوں کے بارے میں اس کے پاس صرف اچھے الفاظ ہوتے ہیں، اور غیروں کے بارے میں صرف برے الفاظ۔

جب امت میں انسانوں کو میرٹ پر جانچنے کا رواج ہو، تو سمجھیے کہ امت زندہ ہے، اور جب امت کے لکھنے اور بولنے والے لوگ حق کے بجائے مدح اور ذم کی زبان بولنے لگیں تو سمجھیے کہ امت مردہ ہو چکی ہے۔ جب امت پر یہ وقت آجائے تو کرنے کا صرف ایک کام باقی رہتا ہے۔ وہ ہے افراد کی اصلاح۔ امت جب زندہ ہو تو مبنی بر اجتماع انداز کارآمد ہوسکتا ہے، لیکن جب امت اپنے دورِ زوال میں پہنچ جائے تو اس وقت افراد کو تلاش کیجیے اور افراد کی اصلاح کو اپنا مقصد بنا لیجیے۔ اس کے سوا کوئی اور طریقہ ہرگز نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا۔ جو لوگ امت کے دورِ زوال میں مبنی بر امت بڑے بڑے پروگرام بنائیں، وہ بلاشبہ فطرت کے قانون سے آخری حد تک ناواقف ہیں۔ ایسے مصلحین خود قابلِ اصلاح ہیں، وہ امت کے مصلح نہیں بن سکتے۔

हौसलामन्दी

अहमद और इक़बाल दोनों एक ही शहर में रहते थे। अहमद बी.ए. पास था जबकि इक़बाल सिर्फ़ आठवीं क्लास तक पढ़ा था।

एक बार इक़बाल को एक सरकारी दफ़्तर में जाना था। वह वहां जाने लगा तो अहमद भी उसके साथ चला गया। दोनों उस दफ़्तर में पहुंचे। अहमद ने देखा कि इक़बाल वहां खूब अंग्रेज़ी बोल रहा है। जब दोनों बाहर निकले तो अहमद ने कहा कि तुम बिल्कुल ग़लत-सलत अंग्रेज़ी बोल रहे थे। मैं तो कभी इस तरह बोलने की हिम्मत नहीं करूंगा। पर इक़बाल को अहमद की इस बात से कोई शर्मिन्दगी नहीं हुई। उसने पूरे विश्वास भरे लेहजे में कहाः

"ग़लत बोलो ताकि तुम सही बोल सको।"

इक़बाल ने कहा कि तुम हालांकि बी.ए. हो और मैं कुछ भी नहीं हूं, मगर देख लेना कि मैं अंग्रेज़ी बोलने लगूंगा और तुम कभी भी न बोल सकोगे।

इस बात को अब बीस साल हो चुके हैं। इक़बाल की बात सौ फ़ीसदी सही साबित हुई। अहमद आज भी वहीं है जहां वह बीस साल पहले था। मगर इक़बाल ने इस अर्से में ज़बरदस्त तरक़्क़ी की। वह अब बेझिझक होकर अंग्रेज़ी बोलता है और बहुत कम लोग ऐसे हैं जो उसकी बातचीत में भाषा की ग़लती पकड़ सकें।

इक़बाल के इस हिम्मती मिज़ाज ने उसको बहुत फ़ायदा पहुंचाया। इससे पहले शहर में उसकी एक मामूली दुकान थी, मगर आज उसी शहर में उसका एक बड़ा कारख़ाना क़ायम है। "ग़लत बोलो ताकि तुम सही बोल सको" यह बात उसके लिए सौ फ़ीसदी सही साबित हुई।

इक़बाल के इस तरीक़े का ताल्लुक़ सिर्फ़ भाषा से नहीं, बल्कि ज़िन्दगी के तमाम मामलों से है। मौजूदा दुनिया में वही लोग कामयाब होते हैं जो हौसले के मालिक हों, जो बेधड़क आगे बढ़ने की हिम्मत कर सकें, जो ख़तरा मोल लेकर क़दम उठाने की हिम्मत रखते हों। इस दुनिया में ग़लती करने वाला ही सही काम करता है। जिसको यह डर लगा हुआ है कि कहीं उससे ग़लती न हो जाए वह ज़िन्दगी की दौड़ में पीछे रह जाएगा। उसके लिए आगे की मंज़िल पर पहुंचना मुक़द्दर नहीं।

रिवाजी ज़ेहन

एलियस हॉव (Elias Howe) अमरीका के मशहूर शहर का एक मामूली कारीगर था। वह 1819 में पैदा हुआ और सिर्फ़ 48 साल की उम्र में 1867 में उसकी मृत्यु हुई। मगर उसने दुनिया को एक ऐसी चीज़ दी जिसने कपड़े तैयार करने में एक इन्क़िलाब पैदा कर दिया। यह सिलाई की मशीन थी जो उसने 1845 में ईजाद की।

एलियस हॉव ने जो मशीन बनाई उसकी सुई में धागा डालने के लिए शुरू में सुई की जड़ की तरफ़ छेद होता था जैसा कि आमतौर पर हाथ की सुइयों में होता है। हज़ारों बरस से इंसान सुई की जड़ में छेद करता आ रहा था। इसलिए एलियस हॉव ने जब सिलाई मशीन तैयार की तो उसमें भी उसने आम रिवाज के मुताबिक़ जड़ की तरफ़ छेद बनाया। उसकी वजह से उसकी मशीन ठीक काम नहीं करती थी। शुरू में वह अपनी मशीन से सिर्फ़ जूता सी सकता था। कपड़े की सिलाई इस मशीन पर मुमकिन न थी।

एलियस हॉव एक अर्से तक इसी उधेड़बुन में रहा मगर उसकी समझ में इसका कोई हल नहीं आता था। आख़िरकार उसने एक ख़्वाब देखा। इस ख़्वाब ने उसका मसला हल कर दिया।

उसने ख़्वाब में देखा कि किसी जंगली वहशी क़बीले के आदमियों ने उसको पकड़ लिया है और उसको हुक्म दिया है कि वह 24 घंटे के अंदर सिलाई की मशीन बना कर तैयार करे। वरना उसको क़त्ल कर दिया जाएगा। उसने कोशिश की पर तय किए गए वक़्त में वह मशीन तैयार न कर सका। जब वक़्त पूरा हो गया तो कबीले के लोग उसको मारने के लिए दौड़ पड़े। उनके हाथ में बरछा था। हॉव ने ग़ौर से देखा तो हर बरछे की नोक पर एक सुराख़ था। यही देखते हुए उसकी नींद खुल गई।

हॉव को सिरा मिल गया। उसने बरछे की तरह अपनी सुई में भी नोक की तरफ़ छेद बनाया और उसमें धागा डाला। अब मसला हल था। धागे का छेद ऊपर होने की वजह से मशीन काम नहीं कर रही थी। वह नीचे की तरफ़ छेद करने के बाद बख़ूबी काम करने लगी।

हॉव के साथ दिक़्क़त यह थी कि वह पारंपरिक ज़ेहन से ऊपर उठ कर सोच नहीं पाता था। वह समझ रहा था कि जो चीज़ हज़ारों साल से चली आ रही है वही सही है। जब उसके अवचेतन ने उसको तस्वीर का दूसरा रुख़ दिखाया तो वह मामले को समझा और उसको फ़ौरन हल कर लिया। जब आदमी अपने आपको जी-जान से किसी काम में लगा दे तो वह इसी तरह उसके रहस्यों को पा लेता है।

अजीब करिश्मा

इन्सान का जिस्म कुछ माद्दी और भौतिक चीज़ों मिल कर बना है। पानी, कार्बन, ऑक्सीजन और कुछ दूसरे रासायनिक तत्व। ज़ाहिरी तौर पर इन्सान बस इसी क़िस्म को कुछ चीज़ों का मजमूआ है। राबर्ट पैटिसन (R. Pattison) ने इन्सानी जिस्म के इन भौतिक तत्वों का हिसाब लगाया तो उसने पाया कि बाज़ार के रेट के लिहाज़ से इनकी क़ीमत साढ़े छः डालर है। यानी हिन्दुस्तानी सिक्के में क़रीब सौ रुपये।

लेकिन इसी 'सौ रुपये' के सामान से अल्लाह तआला ने ऐसा अनमोल आदमी बनाया है, जो इतना क़ीमती है कि सिक्के में उसकी क़ीमत तय नहीं की जा सकती। सौ खरब रुपये भी एक इन्सान की क़ीमत नहीं हो सकते।

इन्सान के बेहद क़ीमती होने का अन्दाज़ा उस वक़्त होता है जबकि उसका कोई अंग उससे छीन लिया जाए। इन्सान का एक हाथ कट कर उससे अलग हो जाए अरबों डालर अदा करके भी दोबारा वैसा हाथ उसको नहीं मिल सकता। इन्सान की आंख अगर बेनूर हो जाए तो सारी दुनिया की दौलत भी उसको वह आंख नहीं दे सकती, जिससे वह दोबारा देखने लगे। इन्सान की ज़ुबान अगर जाती रहे तो कोई भी क़ीमत अदा करके वह बाज़ार से ऐसी चीज़ नहीं पा सकता, जिससे वह बोले और अपने ख़यालात का इज़हार कर सके।

कैसी अजीब है ख़ुदा की कारीगरी कि वह बेक़ीमत चीज़ों से बेइन्तिहा क़ीमती चीज़ बनाता है। वह मुर्दा चीज़ को ज़िन्दा चीज़ में तब्दील करता है। वह बेशऊर, बेजान मादे से बाशऊर और जानदार मख़्लूक़ वजूद में लाता है। वह 'नहीं' से 'है' की रचना करता है।

किसी जादूगर की छड़ी से एक पत्थर कोई आवाज़ निकाले तो उसको देख कर सारे लोग हैरान रह जाएंगे। लेकिन ख़ुदा बेशुमार इन्सानों को मादे से बना कर खड़ा कर रहा है। मगर उसको देख कर किसी को हैरानी नहीं होती। कैसे अंधे हैं वे लोग, जिनको जादूगर के करिश्मे दिखाई देते हैं, मगर ख़ुदा के करिश्मे दिखाई नहीं देते। कैसे बेअक़्ल हैं वे लोग जो झूठे करिश्मे दिखाने वालों के सामने सम्पूर्ण श्रद्धा बन जाते हैं। मगर जो हस्ती सच्चे करिश्मे दिखा रही है, उसके लिए उनके अन्दर श्रद्धा व प्रेम का जज़्बा नहीं उमडता।

हक़ीक़त यह है कि इन्सान अगर ख़ुदा को पा ले तो वह उसके करिश्मों में गुम हो जाए। ख़ुदा के सिवा किसी दूसरी चीज़ का उसे होश न रहे।

सब से बड़ी ख़बर

30 जून 1985 ग्वालियर के लिए एक ऐतिहासिक दिन था आज यहां के फौजी हवाई अड्डे पर विशेष चहल पहल थी। इसका कारण यह था कि भारत ने फ्रांस से जो आधुनिक सैनिक विमान मिराज 2000 खरीदा था उसको भारतीय हवाई सेना में शामिल करने की रस्म यहां अदा की जाने वाली थी।

भारत के बारहवें एयर चीफ मार्शल एल.एम. कत्री (1927-1985) आज बहुत खुश दिखाई दे रहे थे। उन्होंने इस समारोह में पूरे उत्साह के साथ भाग लिया। लेकिन एयर चीफ मार्शल इस शानदार समारोह से दिल्ली वापस लौटे थे कि उन पर दिल का दौरा पड़ा। उन्हें तेज़ी से फौजी अस्पताल ले जाया गया जहां चन्द घंटे बाद पहली जुलाई 1985 को उनका देहांत हो गया।

ख़बरों में बताया गया कि एयर चीफ़ मार्शल एल. एम. कत्री योग्यतम पायलट थे। उन्होंने कई लड़ाइयों में दुश्मन के ख़िलाफ़ हवाई लड़ाई का शानदार रिकार्ड कायम किया था। लेकिन दुश्मन के युद्ध विमानों को मार गिराने वाला शख़्स मौत के खामोश हमले का मुकाबला न कर सका। वह आदमी जिसने आसमान में उड़ कर युद्ध में विजय हासिल की थी वह ज़मीन पर मौत के ख़िलाफ़ जंग में इस तरह पराजित हो गया जैसे उसके मुकाबले के लिए उसके पास कोई ताक़त ही नहीं।

ताकत और बेताक़ती का यह मुक़ाबला हर रोज किसी न किसी रूप में ज़मीन पर दिखाई देता है। रोज़ कोई 'एयर चीफ़ मार्शल' मौत के ख़ामोश हमले के मुकाबले में एकतरफा शिकस्त खा जाता है। और इस तरह अपने तजुर्बे के रूप दूसरों के लिए एक ऐलान करता एक हक़ीक़त का ऐलान कि इन्सान एक ऐसी दुनिया में है जहां हर जीत आख़िरकार एक मुकम्मल हार पर ख़त्म होती है। ज़िन्दगी इख़्तियार से बेइख़्तियारी की तरफ़ सफ़र है। मौत आदमी को इसी हक़ीक़त की ख़बर देती है। लेकिन यही खबर है जो आज किसी को मालूम नहीं।

अंधविश्वास

अमरीकी रिपब्लिकन पार्टी के एक पदाधिकारी श्री सैलर (Sayler) ने बताया था कि अमरीकी (पूर्व) राष्ट्रपति रोनाल्ड रीगन हर वक़्त अपनी जेब में एक छोटी-सी सोने की नाल रखते हैं। यह नाल उनको राष्ट्रपति बनने से लगभग पांच साल पहले उनके एक दोस्त ने दी थी। श्री रीगन को विश्वास है कि इस सुनहरी नाल में चमत्कारिक असर है। वह उनको हर आफ़त से बचाती है 1981 में जब उनके ऊपर क़ातिलाना हमला किया गया तो उनके ख़्याल के मुताबिक़ इस नाल ने उनको बचा लिया।

यह नाल हर वक़्त श्री रीगन के पास रहती है। जून 1981 की एक मुलाक़ात में श्री सैलर ने उनसे पूछा, "क्या आप अब भी इस नाल को अपनी जेब में रखतें हैं?" राष्ट्रपति रीगन ने कहा, "हां, ज़रूर।"

इसके बाद उन्होंने अपनी बाईं जेब में हाथ डाला और वह नाल निकाल कर दिखाई। (*टाइम्स ऑफ़ इंडिया* 24 जून 1981)

बेशक यह एक अंधविश्वास (superstition) है। पर इस अंधविश्वास का एक ज्ञात कारण है। वह यह कि मौजूदा दुनिया में इन्सान के साथ जो कुछ घटता है वह सब इतना रहस्यपूर्ण होता है कि आदमी पूरी तरह उसकी व्याख्या नहीं कर पाता, उसे समझ नहीं पाता। ऐसा मालूम होता है कि कुछ छुपे हुए कारक (factors) हैं जो किसी आदमी को कामयाब और किसी को नाकाम कर देते।

कोई शख़्स एक नतीजे से दो-चार होता है और कोई शख़्स दूसरे नतीजे से। और दोनों में से कोई भी सही अर्थों में नहीं बता सकता कि उसके साथ जो हुआ वह क्यों हुआ? एक बार मैंने एक बड़े व्यापारी से पूछा कि कारोबार में कामयाबी का राज़ क्या है? वह कुछ देर सोचता रहा। आख़िर में कहा कि 'क़िस्मत'; अगर कोई शख़्स तीन कारण पूछे तो मैं कहूंगा क़िस्मत, क़िस्मत, क़िस्मत!

यह रहस्यमय इसलिए है कि सब कुछ करने वाला ख़ुदा है। पर इन्सान चूंकि परोक्ष ख़ुदा को देख नहीं पाता इसलिए वह किसी न किसी दिखाई देने वाली चीज़ को ख़ुदा बना लेता है, चाहे वह सोने की एक नाल हो या पत्थर की एक अंगूठी।

इन्सान मज़बूर है कि वह किसी को अपना मा 'बूद (उपास्य, आराध्य) बनाए- ख़ुदा को या ख़ुदा को छोड़कर किसी और को।

इन्सान किधर

भारत के पूर्व प्रधानमंत्री राजीव गांधी (1944-1991) लोकसभा के दसवें चुनाव (मई 1991) के अभियान पर थे। वह देश भर का तूफ़ानी दौरा करते हुए 21 मई 1991 को अपने विशेष विमान के ज़रिए तमिलनाडु पहुंचे। वह हवाई अड्डे मीनमपक्कम पर उतरे। यहां वह अपनी बुलेट प्रुफ़ गाड़ी में बैठे। और तीस से ज़्यादा कारों के काफिले के साथ श्रीपेरुम्बुदुर के लिए रवाना हुए, जहां उन्हें एक चुनाव-सभा को सम्बोधित करना था।

रात को दस बजे वह पंडाल के अन्दर जनता की तरफ़ से गुलदस्ते स्वीकार कर रहे थे। उसी दौरान एक 25 वर्षीया महिला अपने दोनों हाथों में फूलों का एक गुलदस्ता लिए हुए राजीव गांधी की तरफ़ बढ़ी। राजीव गांधी भी विजयभाव से उसकी तरफ़ बढ़े, क्योंकि हर जगह जनता से मिले स्वागत ने उन्हें यकीन दिलाया था कि इस चुनाव के बाद वे देश के प्रधानमंत्री बनने वाले हैं।

महिला ने पास आकर अपना गुलदस्ता राजीव गांधी की तरफ़ बढ़ाया। पर उस महिला का सम्बंध आत्मघाती दस्ते से था और वह अपने जिस्म पर ख़तरनाक बम बांधे हुए थी। राजीव गांधी ने गुलदस्ता अपने हाथ में लिया ही था कि बम फट गया। राजीव गांधी पूरी तरह उसकी चपेट में आ गए। उनका जिस्म टुकड़े-टुकड़े हो गया। तत्काल उनकी मृत्यु हो गई।

ज़ाहिरी तौर पर यह बम का धमाका था, पर हक़ीक़त में वह मौत का धमाका था, जो हर इन्सान के लिए नियत है। इस लिहाज से यह सिर्फ़ राजीव गांधी की कहानी नहीं, बल्कि हर इन्सान की कहानी है। हर आदमी यह समझता है कि वह कामयाबी की तरफ़ बढ़ रहा है। हर आदमी का हाथ खुशियों के गुलदस्ते पर है। पर सच्चाई उसकी उम्मीदों के विपरीत है। जिस चीज़ को आदमी गुलदस्ता समझ कर वसूलकर रहा है वह उसके लिए विनाश का बम है।

इसके अपवाद सिर्फ़ वे लोग हैं, जिनको मौत से पहले अपने रब का बोध हासिल हो गया, जिन्होंने अपनी ज़िन्दगी को सृष्टि के पालनहार के आज्ञापालन में गुज़ारा, जिनको मौत इस हाल में आई कि वे अपने इम्तिहान के पर्चे को कामयाबी के साथ हल कर चुके थे।

जंग नहीं

टाइम्स ऑफ इंडिया (4 दिसम्बर 1989) ने एक सार्वभौमिक आकलन शुरू किया था। इसमें बताया गया कि आज दुनिया के कूटनीतिक किस अन्दाज़ में सोचते हैं। इसमें बिल्कुल दुरुस्त तौर पर आधुनिक ज़ेहन की नुमाइन्दगी करते हुए कहा गया कि विश्व शक्ति या समाजी तब्दीली के लिए जंग के हथियार का इस्तेमाल अब एक नामुमकिन चीज़ बन चुका है।

मौजूदा ज़माने में ऐसे बहुत से सबब सामने आए हैं, जिन्होंने जंग के तरीके को एक नामुमकिन तरीक़ा बना दिया है। आज कोई क़ौम जंग करके वह फ़ायदा हासिल नहीं कर सकती, जो पुराने ज़माने में शासक वर्ग इससे हासिल किया करता था।

नई सूरतेहाल ने तमाम दुनिया में लोगों का ज़ेहन बदल दिया है। तमाम लोग टकराव के बजाय बातचीत के तरीके की वकालत करने लगे हैं। जिन देशों के

पास सबसे ज़्यादा जंगी ताकत है, वे भी आपस में सुलह व समझौते की बातें कर रहे हैं, ताकि उनमें टकराव की नौबत न आए।

आज की दुनिया में अब सिर्फ़ एक क़ौम ऐसी है जो आज भी जंग में मश्गूल है, जिसके रहनुमा आज भी लड़ रहे हैं। मुस्लिम रहनुमा आज भी जंगी भाषा में जोशीली तक़रीरें करने में मश्गूल हैं।

आज बेहद ज़रूरी हो गया है कि मुसलमानों के अन्दर बेमानी लड़ाई का मिज़ाज़ ख़त्म किया जाए। उनकी ज़ेहनी तरबियत के ज़रिए उन्हें ऐसा बनाया जाए कि वे आज की दुनिया को समझें और तलवार के बजाय नज़रियों और विचारों की ताक़त से अपनी ज़िन्दगी की तामीर करें।

यह सूरते-हाल अल्लाह की अज़ीम नेमत है, जो पूरी तरह मुसलमानों के हक़ में है। इस तरह ख़ुदा इतिहास को मुक़ाबले के उस मैदान में लाया है, जहां इस्लाम साफ़ तौर पर निर्णायक हैसियत रखता है। भौतिक ताक़त में कोई दूसरा इस्लाम वालों से आगे बढ़ सकता है, मगर विचार और नज़रिए के मामले में इस्लाम को एकाधिकार (monopoly) की हद तक अटूट ताकत हासिल है। हथियार के मैदान में जीत और हार दोनों की संभावना है। मगर वैचारिक मुकाबले में इस्लाम की फ़त्ह यक़ीनी है। यहां कोई उसके ऊपर फ़तह पाने वाला नहीं।

एक और आवाज़

जब एक इन्सान बोल रहा हो और आप उसकी बात सुन रहे हों तो यह कोई असाधारण घटना नहीं होती। यह एक बेहद अनोखी घटना होती है, जो हमारी ज़मीन पर घटती है। एक शख़्स का बोलना और दूसरे शख़्स का सुनना अपने अन्दर इतनी ज़्यादा निशानियां रखता है कि आदमी अगर इस पर सोचे तो वह हैरत के समुद्र में डूब जाए।

ऐसी अजीब घटना क्यों होती है? यह इसलिए होता है ताकि इन्सान एक महान् हक़ीक़त को महसूस कर सके। वह इन्सानी कलाम के ज़रिए ख़ुदाई कलाम को अपनी कल्पना में लाए।

जिस तरह एक इन्सान बोलता है और आप सुनते हैं, उसी तरह ख़ुदा भी बोल रहा है। वह भी इन्सानों से संवाद कर रहा है। जो शख़्स इन्सान की बात सुने पर वह ख़ुदा की बात न सुने वह बहरा है। आदमी को कान इसलिए दिए गए हैं कि वह ख़ुदा की बात सुनने वाला बनें। मगर उसका हाल यह हुआ कि इन्सानों की बात उसको सुनाई दी पर ख़ुदा की बात उसको सुनाई न दी। ऐसा शख़्स यक़ीनन बहरा है, उसके बहरा होने में कोई शक नहीं, चाहे वह देखने में कान वाला क्यों न दिखाई देता हो।

इन्सान की हर चीज़ ख़ुदा के लिए है। उसको कान इसलिए दिए गए थे कि वह ख़ुदा की बात सुने। कान के अन्दर दूसरी आवाज़ों को सुनने की क्षमता इसलिए रखी गई थी कि उसको क़रीबी तजुर्बे से मालूम हो जाए कि वह 'सुनने की सलाहियत रखता है। पर जो चीज़ सिर्फ़ प्रारम्भिक तजुर्बे के लिए थी उसी को उसने आख़िरी तजुर्बा समझ लिया। वह रास्ते में अटक कर रह गया। वह असली मंज़िल तक नहीं पहुंचा।

इन्सान की बात को शख़्स फल का छिलका सुनना और ख़ुदा की बात को न सुनना ऐसा ही है जैसे कोई खाए पर उसका गूदा फेंक दे। वह दिए की रोशनी को रोशनी समझे, पर सूरज की रोशनी का रोशनी होना उसे मालूम न हो।

ऐसा आदमी बेशक अंधा है, चाहे उसके सिर पर दो आंखें मौजूद हों, चाहे दुनिया के रजिस्टर में उसका नाम देखने वालों की फेहरिस्त में लिखा हुआ हो।

ज़माने के ख़िलाफ़

शहर की पॉश कालोनी में एक आदमी आवाज़ लगा रहा था: बर्तन कलई वाला, बर्तन कुलई वाला।

वह आवाज़ लगाता हुआ तमाम सड़कों पर घूमता रहा। पर शानदार मकानों में से किसी ने भी उसकी तरफ़ ध्यान न दिया। हो सकता है 'बर्तन कलई वाला' इसी तरह सोचता हों। वह एक जहिल आदमी था। उसके बाप-दादा यही काम करते थे। वह खुद चालीस साल से यही काम कर रहा है। इसलिए उसका ज़ेहन बर्तन क़लई' में इतना गुम हो चुका है कि वह इससे बाहर निकल कर सोच नहीं सकता।

लेकिन जो शख़्स 'बर्तन क़लई' से बाहर की हक़ीक़तों को जानता हो, जो व्यापक दायरे में सोच सके, वह आसानी से समझ सकता है कि बर्तन क़लई वाले को कालोनी में काम न मिलने की वजह क्या थी। इसकी सीधी-सी वजह यह थी कि क़लई का काम तांबे-पीतल के बर्तनों में होता है, जबकि कालोनी के तमाम घरों में स्टेनलेस स्टील के बर्तन इस्तेमाल हो रहे थे, फिर यहां बर्तन क़लई वाले को काम मिलता तो किस तरह मिलता?

मौजूदा दुनिया में कामयाबी के लिए जिन चीज़ों की ज़रूरत है, उनमें से एक यह है कि आदमी वक़्त को पहचाने। वह ज़माने के तक़ाज़ों को समझे। जो शख़्स वक़्त और ज़माने को न जाने उसका हाल वही होगा जो ऊपर बताये गए आदमी का हुआ। वह स्टेनलेस स्टील इस्तेमाल करने वालों के बीच 'बर्तन क़लई' की आवाज़ लगाता रहेगा और वहां कोई भी शख़्स न मिलेगा जो उसका ख़रीदार बन सके। वह ज़माने के ख़िलाफ़ चलने वाली अपनी दुकानदारी में नाकाम होगा और फिर दूसरों को इल्ज़ाम देगा कि उन्होंने पक्षपात और जुल्म की वजह से मेरी दुकान चलने न दी। योग्यता के दौर में आरक्षण की मांग, सार्थकता की दुनिया में शब्दों के चमत्कार दिखाना, हक़ीक़त के बाज़ार में खुशख्याली की क़ीमत पर सौदा हासिल करने की कोशिश, यह सब इसी क़िस्म की ज़माने के ख़िलाफ़ हरकत है। और ऐसी हर कोशिश का एक ही अंजाम है, और वह यह कि उनका कोई अंजाम नहीं।

प्राकृतिक तक़ाज़ा

ब्रह्मचर्य (अविवाहित जीवन) को कुछ धर्मों में पवित्र माना गया है। लेकिन जब भी ब्रह्मचर्य को व्यवहार में लाया गया, समाज में असाध्य ख़राबियां पैदा हो गईं। मसलन यूनान में ब्रह्मचर्य (celibacy) पर अमल करने का अंजाम यह हुआ कि उनकी आबादी में गैर-मामूली कमी आ गई। इसी तरह मसीही चर्च में ब्रह्मचर्य को उच्च मानदंड माना गया, जिसका नतीजा इतना बदतर निकला कि उनमें विवाहेतर सम्बन्ध और नाजायज़ औलाद की समस्याएं पैदा हो गईं।

यह प्रकृति से हटने की सज़ा है। जब भी इन्सान के किसी प्राकृतिक तक़ाज़े पर पाबंदी लगाई जाएगी, यह पाबंदी भयंकर बुराइंया पैदा करेगी। जो तकाज़ा रचनात्मक रूप से इन्सान की प्रकृति में शामिल हो उस पर रोक लगाना मुमकिन नहीं। ऐसे किसी तक़ाज़े पर रोक लगाना सिर्फ़ इस क़ीमत पर होता है कि और भी ऐसी भयंकर बुराइयां पैदा हो जाएं, जिन पर नियंत्रण करना संभव न हो।

इसी क़िस्म की अप्राकृतिक पाबंदी की एक मिसाल लोगों को आलोचना (तनक़ीद) से रोकना है। आलोचना अन्य प्राकृतिक तक़ाज़ों की तरह एक स्वाभाविक तक़ाज़ा है। अगर इस पर रोक लगाई जाए तो इसका नतीजा सिर्फ़ यह होगा कि लोगों के दिलों में तो कुछ होगा, पर वे मुंह से कुछ और कहेंगे। इस तरह लोगों के अन्दर 'मुनाफ़िक़त' (पाखंड) की बुराई पैदा हो जाएगी और मुनाफ़िक़त तमाम बुराइयों में सबसे ज़्यादा बड़ी बुराई है।

यह एक स्वाभाविक सच्चाई है कि लोगों की सोच में फ़र्क़ होता है, इसलिए लोगों की राय में मतभेद पैदा हो जाता है। इसी वैचारिक मतभेद का नाम आलोचना है। आलोचना वैचारिक मतभेद के कारण प्रकट होती है और वैचारिक मतभेद प्रकृति के अनिवार्य तक़ाज़े के कारण।

आलोचना पर रोक लगाने से आलोचना का असली कारण तो ख़त्म न होगा; हां,

इसका व्यावहारिक नतीजा यह होगा कि लोग 'मुनाफ़िक़' बन जाएंगे। लोगों के दिलों में आलोचना होगी और जुबान पर तारीफ़। वे बनावटी बाते करेंगे। उनके कथन और उनके भाव में प्रतिबद्धता न रहेगी। इसी 'दो-अम्ली' (दोहरे चरित्र) का नाम मुनाफ़िक़त है। सही बात यह है कि आलोचना को बर्दाशत करने का स्वभाव पैदा किया जाए, न कि आलोचना पर रोक लगाई जाए। आलोचना को बर्दाश्त करने से स्वस्थ समाज बनता है और आलोचना को बंद करने से मुनाफ़िक़ (पांखडी) समाज।

एक नसीहत

बेन्जामिन फ्रैंकलिन एक अमरीकी चिंतन था। वह 1706 में पैदा हुआ और 1790 में उसकी मृत्यु हुई। उसका एक वाक्य है- शादी से पहले अपनी आंखें खूब खुली रखो, पर शादी के बाद अपनी आधी आंख बन्द कर लोः

Keep your eyes wide open before marriage, half shut afterwards.

यानी शादी करने से पहले अपने जोड़े के बारे में पूरी जानकारी हासिल करो, लेकिन जब शादी हो जाए तो उस पर संतोष करो। इसी बात को किसी ने सादा तौर पर इन शब्दों में कहा कि शादी से पहले जांचो और शादी के बाद निभाओ।

कोई मर्द या औरत 'परफेक्ट' नहीं। कोई भी संपूर्ण या परम आदर्श नहीं। इसलिए रिश्ते से पहले जांच तो ज़रूर करनी चाहिए, लेकिन रिश्ते के बाद यह करना चाहिए कि अपने जीवन साथी की खूबियों को देखा जाए और कमियों को नज़रअंदाज़ कर दिया जाए।

इस दुनिया में 'परफेक्ट' का मिलना संभव नहीं। फिर यह भी ज़रूरी नहीं कि जिस चीज़ को एक व्यक्ति श्रेष्ठ समझे वह दूसरे के लिए भी श्रेष्ठ हो। इसलिए कोई कितना ही ज़्यादा सही हो वह दूसरे को आख़िरी हद तक संतुष्ट नहीं कर सकेगा, दोनों को एक-दूसरे के अन्दर कुछ न कुछ कमियां नज़र आएंगी।

अब एक तरीका यह है कि दूसरे की कोताही से लड़कर उससे सम्बन्ध विच्छेद कर लिया जाए। लेकिन मुश्किल यह है कि एक सम्बन्ध को तोड़ने के बाद दूसरा जो सम्बन्ध जोड़ा जाएगा उसमें भी जल्द ही वही या कोई दूसरी ख़ामी प्रकट हो जाएगी, और अगर दूसरे रिश्ते को ख़त्म करके तीसरा या चौथा किया जाए तो उसमें भी। ऐसी हालत में तालमेल का तरीका अपनाना चाहिए। हर मर्द या औरत में खूबी भी होती है और कोताही भी, ज़रूरत है कि खूबी को देखा जाए और कोताही को बर्दाशत किया जाए। अमली तौर पर यही एक मुमकिन तरीक़ा है। इसके सिवा और कोई तरीक़ा इस दुनिया में व्यवहार्य नहीं।

इस्लाम की तस्दीक़

अमरीकी औरतों में आजकल एक नया आन्दोलन उभर रहा है, जिसे 'महिला आन्दोलन द्वितीय' (Women's Movement II) का नाम दिया गया है। इस आंदोलन का झंडा उठाने वालों के दावे के मुताबिक यह पुराने महिला आन्दोलन ही का विस्तार है। लेकिन ज़्यादा सही बात यह है कि यह दरअसल इस बात को मान लेना है कि पुराना महिला आन्दोलन एक बेतुका आन्दोलन था। इसलिए उस पर फिर से नज़र डालने की ज़रूरत पड़ी।

एक समीक्षक ने ठीक ही इसे आन्दोलन में एक खामोश तब्दीली (quiet shift) कहा है। अमरीकी पत्रिका स्पान (Span) के जुलाई 1989 अंक में इस आन्दोलन का परिचय छपा है। इसमें बताया गया है कि मौजूदा अमरीका की औरतें बदहाली का शिकार हैं। काम करने वाली औरतों की दो तिहाई तादाद 13000 डालर सालाना से कम कमाती है, जो अमरीका में ज़िन्दगी गुज़ारने के लिए नाकाफी है। गर्भ ठहरना, बच्चों की देखभाल और दूसरे मसलों ने औरत को सख़्त परेशानी में डाल दिया है। अमरीका में 25-45 साल के बीच की औरतों की 80 प्रतिशत तादाद दफ्तरों और कारखानों में काम करती है। मगर औरतों को आम तौर पर मर्दों से कम तनख़्वाह मिलती है। बड़े ओहदे उन्हें हासिल नहीं।

महिला आन्दोलन का सारा ज़ोर इस पर था कि औरत और मर्द हर लिहाज़ से बराबर हैं। औरतों को अगर आज़ादी मिल जाए तो वे मर्दों ही की तरह अपनी ज़िन्दगी की तामीर कर सकती हैं। औरतों को मुकम्मल आज़ादी मिल गई। पर अब मालूम हुआ कि औरत को आज़ादी के साथ सुरक्षा (Protection) की ज़रूरत है। सिर्फ़ अपने निजी आधार पर वह खड़ी नहीं हो सकती।

महिला आन्दोलन द्वितीय की एक नेता टार व्हेलम (Tarr-Whelam) ने कहा कि यह बात साफ़ है कि औरतों के हुकूक (अधिकार) हासिल करने के लिए अब राज्य ही हमारे लिए अमल का मुक़ाम हैं:

> But it is clear that to win women's rights, the states are now the place for action (p. 37).

पश्चिमी औरत ने पहले बराबरी का हक़ मांगा था। उसको बराबरी का हक़ मिल गया। अब उसे मालूम हुआ कि सिर्फ़ बराबरी का हक़ काफ़ी नहीं। उसको इसी के साथ एक्सट्रा सपोर्ट की ज़रूरत है। वह घरेलू सरपरस्त को अपना सरपरस्त बनाने पर राजी नहीं हुई। नतीजा यह है कि उसे हुकूमत को अपना सरपरस्त (संरक्षक) बनाना पड़ा।

इस तरह की घटनाएं बताती हैं कि ज़माना आज इस्लाम के अनुकूल दिशा में जा रहा है। इन्सान के अनुभव उसको इस तरफ़ ले जा रहे हैं कि वह यह मानने पर मजबूर हो जाए कि ख़ुदा का कानून ही सही कानून है।

कोई बड़ा काम सिर्फ़ वह शख़्स करता है जो अपने आपको छोटा काम करने पर राज़ी कर ले

दृष्टिहीन, दृष्टिवान

दिन और रात का फ़र्क़ उसके लिए है जो आंखो वाला हो; जो आदमी नेत्रहीन हो उसके लिए दिन और रात के बीच कोई फ़र्क़ नहीं। उसके लिए दिन भी वैसा ही है जैसी रात। उसके लिए ज़िन्दगी अंधेरों का एक अथाह समुद्र है, जहां कोई उजाला नहीं। उसके लिए दुनिया एक अनन्त अंधकारपूर्ण शून्य है, जिसमें रोशनी की कोई किरण नहीं।

यही हाल अर्थ के लिहाज़ से उस इन्सान का है, जो 'दृष्टि' न रखता हो, जानने-समझने की संवेदना न रखता हो। ऐसे इन्सान के लिए सत्य और असत्य में कोई फ़र्क़ नहीं। उसके लिए सच भी वैसा ही होगा जैसा झूठ। उसके लिए जुल्म भी वैसा ही होगा जैसा इन्साफ़।

'दृष्टि वाले' और 'बिना दृष्टि वाले इन्सान के बीच इससे भी ज़्यादा बड़ा फ़र्क़ है जो तथ्यों की समझ के बारे में पैदा होता है। 'दृष्टि' वाले आदमी के अन्दर 'सूझबूझ' होती है, जो सच्चाई को सच्चाई के रूप में और झूठ को झूठ के रूप में दिखाती है। उसकी बातों में स्तरहीनता और विरोधावास नहीं होता। वह हमेशा लगती हुई बात कहता है। उसकी जुबान सच्चाई के मुताबिक़ खुलती है। वह वही बात कहता है जो कहना चाहिए और वह बात नहीं कहता, जो कहने वाली नहीं।

इसके बरअक्स जो आदमी 'दृष्टिहीन' हो उसकी समझ अंधेरे में भटकने वाली समझ होती है। वह कभी कुछ कहता और कभी कुछ। उसकी बातों में सस्तापन और विरोधावास होता है। उसकी बातें अर्थहीन होती हैं, पर शब्दों से भरी होती हैं।

आप नेत्रवान आदमी को देखें तो उसके चेहरे पर रौनक दिखाई देगी। इसके बरअक्स नेत्रहीन आदमी के चेहरे पर एक तरह की बेरौनकी छाई हुई होती है। यही हाल दृष्टिहीन (बे-बसीरत) कथन और दृष्टिवान (बा-बसीरत) कथन का है। एक सुरुचिपूर्ण आदमी कुछ बातें सुनकर या कुछ पंक्तियां पढ़कर जान लेता है कि कहने वाला आदमी दृष्टिहीन आदमी है या दृष्टिवान।

BOOKS FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM

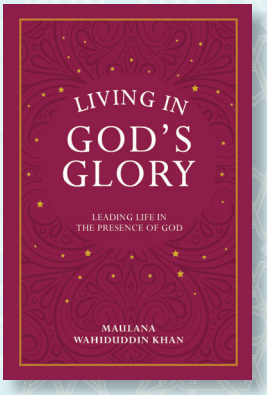

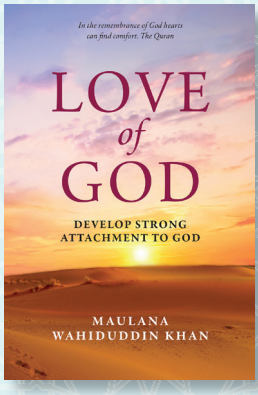

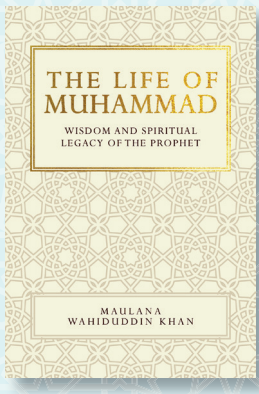

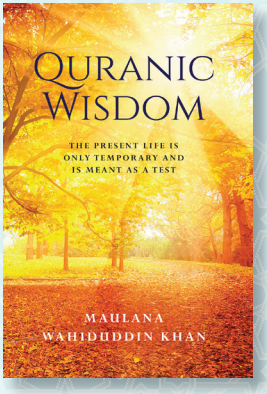

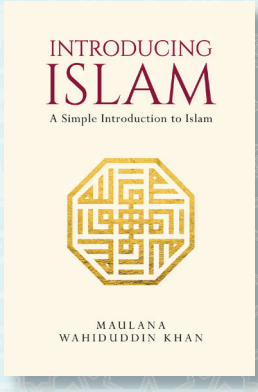

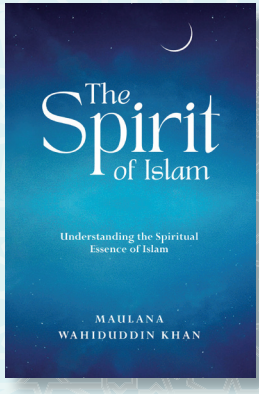

These books provide the general reader with an accurate and comprehensive picture of Islam– the true religion of submission to God.

To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23